ناولٹ
پرائڈ آف پرفارمنس
عمیرہ احمد
دو نسلوں کے رویوں پر محیط یہ کہانی ایک ایسے فن کار کی ہے جس
نے بالآخر وہ مقام پا لیا تھا جس کی اُسے خواہش تھی۔

دربارِ شاہانہ، تخت و تاج، خدام اور کنیزیں قطار در قطار دست بستہ سر جھکائے خدمتِ شاہ میں موجود تھے۔ خدام مورچھل لیے حاضرِ خدمت تھے۔ شہنشاہ اکبر بڑے کرّوفر سے تخت پر جلوہ فرما تھے۔ انارکلی کو سزا سنائی جا چکی تھی۔ کنیزیں اُس کی بے بسی اور بربادی پر تڑپ رہی تھیں۔ انارکلی التجا کر رہی تھی: "ظلِ الٰہی، ظلِ الٰہی رحم، میں نے محبت کی ہے کوئی جرم نہیں کیا۔ مجھ پر یہ لطف و عنایات صاحبِ عالم نے خود فرمائی تھی۔"

لیکن ظلِ الٰہی "ظلِ الٰہی" تو تبر تھے جو رحم فرما دیتے، لہٰذا حکم صادر ہوا اور انارکلی کو خدام گھسیٹ کر دربار سے لے جانے لگے کہ اچانک انارکلی نے صدائے احتجاج بلند کی: "ظلِ الٰہی مجھے کچھ عرض کرنے کی اجازت دی جائے۔"

"اجازت نہیں ہے۔" شہنشاہِ اکبر نے گرج کر درخواست مسترد کر دی۔

"ظلِ الٰہی اجازت دی جائے۔" انارکلی نے بھی اتنے ہی زور سے چلّا کر کہا۔ ظلِ الٰہی نے نگاہِ غلط انداز سے انارکلی کو گھورا۔

"گستاخ کنیز، تمہاری کوئی التجا قابلِ قبول نہ ہوگی۔"

"شہنشاہِ عالم جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں۔"

"اجازت ہے۔"

"ظلِ الٰہی کا اقبال بلند رہے۔ اعلیٰ حضرت آپ فوراً سے پیشتر اپنے تاج کی خبر لیجئے۔ آپ کی لمبی چوٹی تاج سے باہر لٹک رہی ہے۔"

اتنا سننا تھا کہ شہنشاہ اکبر گھبرا کر تخت کے اوپر چڑھ گئے۔ "ہائے اللہ میں نے تو بہت کمانٹ کر کے تاج کے اندر باندھی تھی۔"

قہقہے آسمان کو چھو رہے تھے۔ خدام اور انارکلی ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ کر ہنستے ہنستے دوہرے ہو گئے۔ مورچھل تخت پر پڑے تھے۔ کنیزیں اور درباری تخت پر جلوہ فرما ہو چکے تھے۔ تاج کو توال نے اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیا تھا۔ شہنشاہ اکبر نے ناک بھوں چڑھا کر اپنے دربار کی حالتِ زار پر نظر ڈالی اور مورچھل اٹھا کر گرجے۔ "گستاخ درباریو، تم نے ہمارا پیار دیکھا ہے غصہ نہیں دیکھا۔" اور جھپٹ کر مورچھل ملکۂ عالیہ کے رسید کیا جو ایک خادم کے گلے میں باہیں ڈالے والز (ایک یورپی رقص) فرمانے کی کوشش میں مصروف تھیں۔ ملکۂ عالیہ نے تڑپ کر دوسرا مورچھل اٹھا لیا اور اس سے پہلے کہ جنگ برپا ہو جاتی، کالج کی پرنسپل کی آمد نے ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ خاموش کر دیا۔

"کیسی جا رہی ہے آپ لوگوں کی تیاری؟"

"ویری فائن میڈم۔" لڑکیوں کے چہروں پر ہنوز ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی۔

"ویری گڈ، اس کا مطلب ہے آپ لوگ کل کے فنکشن کے لیے تیار ہیں؟"

"جی بالکل۔" ذرا دیر خاموشی رہی اور اس کے بعد میڈم کا رُوئے سخن ملکۂ عالیہ بنی ناز آفتاب کی طرف ہو گیا۔

"ناز، آپ انارکلی کا رول کیوں نہیں کرتیں۔ آپ تو بہت بڑے فنکار کی بیٹی ہیں۔ آپ میں تو یہ صلاحیت خداداد موجود ہوگی۔"

"نہیں میڈم وہ ۔۔۔۔۔۔ وہ دراصل رابعہ انارکلی زیادہ اچھی بنی تھی۔ اس لیے میں نے کہا یہ رول وہ کرے گی۔" ناز اس بات کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

"دراصل میڈم ہماری رابعہ کی ناز سے بہت اچھی فرینڈ شپ ہو گئی ہے۔ انھوں نے فرینڈ شپ نبھائی ہے۔" مس سلطانہ فاطمہ نے وضاحت کی۔

"او، آئی سی، پرفیکٹ ہے۔ او کے گرلز کیری آن۔" میڈم ہلکے پھلکے انداز میں اُن کی حوصلہ افزائی کر کے آگے بڑھ گئیں۔ ناز آفتاب کے چہرے کا رنگ واپس آ گیا۔

**

"ناز، ایک بات پوچھوں۔" رابعہ اور ناز کلاس سے باہر طویل کوریڈور میں سے گزر رہی تھیں۔

"پوچھو۔"

"اُس دن فنکشن کی تیاری میں، میڈم کی بات پر تم گھبرا کیوں گئی تھیں؟"

"میں، نہیں تو۔"

"جھوٹ مت بولو۔" رابعہ نے رک کر اُسے غصّے سے دیکھا۔

"نہیں بابا ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اصل میں ابھی میں نئی نئی ہوں ناں تو مجھے ٹیچرز وغیرہ کے انداز کا پتا نہیں ہے اسی لیے۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ مجھے اس طرح نام سے مخاطب کر لیں گی۔ اسٹیٹس میں کبھی میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا تھا۔"

"لو بھلا تمہیں نام سے کیسے مخاطب نہ کرتیں۔ تم

ایک عام لڑکی تھوڑی ہو ہماری طرح۔ ملک کے مشہور ترین فنکار کی بیٹی ہو آخر۔ یہاں تو لوگ نام کے دیوانے ہیں۔" اُس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ رابعہ اُسی دُھن میں بولے چلی گئی۔ "اچھا ہے ناز، عزیز آفتاب میرے فیورٹ آرٹسٹ ہیں ہمیشہ سے اور تم بالکل اُن کی [illegible] ہو۔ میں نے تو کبھی اسکول لائف میں بھی اُن کے پروگرام مِس نہیں کیے۔ حد یہ ہے کہ پاپا بھی اُن کے کوئی پروگرام نہیں چھوڑتے اور تم تو ہر وقت اُن کے سامنے ہوتی ہو گی پھر کتنا ہنساتے ہوں گے ناں وہ گھر میں تم لوگوں کو۔"

"شٹ اپ رابعہ۔" ناز نے اُسے ٹوکا۔ "یہ تم لوگ ہر بات یہی کیوں سمجھتے ہو کہ وہ گھر میں بھی ایکٹنگ کرتے ہوں گے، ایسا نہیں ہوتا۔ یہ ڈراما وراما گھر میں وہ صرف ڈیڈی ہوتے ہیں۔" ناز کی آواز نہ چاہتے ہوئے بھی سخت ہو گئی۔ اُس کے لہجے کی تبدیلی نے رابعہ کو حیرت زدہ کر دیا۔

"ناز۔" اُس نے ناز کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ "میں نے کوئی ایسی غلط بات کہہ دی۔"

"ارے نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔" ناز نے خود کو تیزی سے سنبھال لیا۔ "اصل میں پتا نہیں لوگ کیوں اپنی مرضی سے ہمیں فنکاروں کے بچے سمجھ کر طرح طرح کی باتیں خود ہی سوچ لیتے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔ یہ بھی ایک کام ہے ایک جاب ہے اور کاموں کی طرح۔ بھلا گھروں میں ایسے تھوڑی ہوتا ہے ہم لوگ بھی گھر میں عام لوگوں کی طرح رہتے ہیں۔"

اسی اثناء میں لڑکیوں کو لائبریری کی طرف آتا دیکھ کر وہ دونوں بھی بیگ اٹھا کر اُن کے ساتھ چل پڑیں اور اُس دن بات آئی گئی ہو گئی۔

لیکن اس واقعے کے ایک ہفتے بعد ناز کلاس میں [illegible] منٹ لیٹ آئی تو رابعہ نے دیکھا اُس کا چہرہ اترا اترا سا تھا۔ اُس کے اور ناز کی سیٹ کے درمیان کافی لڑکیاں تھیں۔ رابعہ نے اشارے سے اُس سے وجہ پوچھی تو وہ نفی میں سر ہلا کر لیکچر کے پوائنٹس نوٹ کرنے لگی۔ آخر جب پیریڈ اوور ہونے کی بیل بجی تب رابعہ اٹھ کر اُس کے ساتھ والی بینچ پر جا بیٹھی۔ لڑکیاں کلاس سے اٹھ کر باہر جا رہی تھیں۔ ناز نے کئی لڑکیوں کو اُن کی آٹوگراف بکس واپس کیں جن لڑکی کو پتا چلتا تھا کہ وہ عزیز آفتاب کی بیٹی ہے تو وہ اُسے آٹوگراف بک ضرور تھما دیتی تاکہ وہ ایک بڑے فنکار کا آٹوگراف حاصل کر سکے۔

کلاس خالی ہو گئی مگر ناز ابھی تک نوٹ بک پر آڑی ترچھی لکیریں بنانے میں مصروف تھی۔ "اب بتاؤ کیا بات ہے؟" رابعہ نے لڑکیوں کے آخری گروپ کو باہر جاتے دیکھ کر گفتگو کا آغاز کیا۔

"کچھ نہیں۔" ناز کی گردن بدستور جھکی ہوئی تھی۔

"کچھ نہیں تو تمہاری شکل پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟"

"بس ایسے ہی۔" وہ ابھی بھی مکمل طور پر بیزار تھی۔

"ایسے ہی کیسے۔ سیدھی طرح بتاؤ۔" رابعہ نے اصرار کیا تو وہ خاموش نہ رہ سکی۔

"رابعہ، میں بہت تھک گئی ہوں۔" اُس نے بے بسی سے نظر اٹھائی تو پہلی بار رابعہ نے اُس کی سوجی ہوئی آنکھیں دیکھیں۔ اُسے لگا وہ بہت دیر تک روتی رہی ہے۔

"بات کیا ہے، کچھ بتاؤ گی تو پتا چلے گا ناں۔"

"کل ڈیڈی کو پتا چل گیا کہ میں نے کالج کے ڈرامے میں ایکٹنگ کی ہے۔" اُس کی کیفیت رو دینے والی تھی۔

"تو پھر، وہ تو بہت خوش ہوئے ہوں گے۔ اس میں رونے والی کون سی بات ہے؟" رابعہ کو شدید حیرت تھی۔

"ہاں خوشی کے اثرات نظر آ تو رہے ہیں تمہیں میرے چہرے پر۔" ناز پھٹ پڑی۔ آنکھوں میں رکا ہوا سیلاب پلکوں کا بند توڑ کر بالآخر باہر آنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ اور آنسوؤں کے ایک ایک قطرے میں گزشتہ رات کی داستان تحریر تھی۔

**

وہ ٹی وی لاؤنج میں بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی بہنوں کے ساتھ پروگرام دیکھ رہی تھی کہ ڈیڈی کی گاڑی کی آواز سنائی دی اور ذرا دیر میں ہی اُس کے ڈیڈی یعنی ملک کے مشہور و معروف فنکار عزیز آفتاب نے کمرے کے اندر قدم رکھا۔ وہ اٹھ کر باہر جانے لگی تو عزیز آفتاب نے اُسے آواز دے کر روکا۔ اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ آج ڈیڈی کو اس کی حرکات کا پتا چل گیا ہے۔

"تو تم ایکٹنگ کرنا چاہتی ہو؟" انھوں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے استفسار کیا۔

"نہیں، نہیں تو، ڈیڈی۔" وہ صرف اتنا کہہ سکی۔

"نہیں تو کا کیا مطلب، تم نے اپنے کالج کے ڈرامے میں ایکٹنگ نہیں کی ہے؟" اُن کی تیز آواز پر اُس کی والدہ بھی ٹی وی لاؤنج میں آ گئیں۔ وہ مکمل طور پر ایک

ہاؤس وائف تھیں۔ وہ تڑپ کر ماں کے پیچھے ہو گئی۔

"کیا بات ہے؟" انھوں نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا جو گھر کے باہر ایک فنکار تھا لیکن گھر کے اندر صرف ایک مرد۔ ایک گھر کا روایتی سربراہ۔

"پوچھو اپنی بیٹی سے، یہ ایکٹریس بننے جا رہی ہے۔"

"نہیں ڈیڈی، وہ ---- وہ تو صرف ایک کالج کا ڈراما تھا۔"

"اسی طرح ہوتا ہے۔ پہلے کالج کا ڈراما، پھر چھوٹی اسکرین، اس کے بعد بڑی اسکرین۔"

"ممی ڈیڈی، یہ اس کا شوق تو نہیں ہے لیکن کالج میں تو سب ہی لڑکیاں کچھ نہ کچھ کر لیتی ہیں۔" نفیس کی مداخلت نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا۔

"تم چپ رہو۔" عزیز آفتاب نے دہاڑ کر کہا۔ "تمہارا باپ دن رات محنت کرتا ہے۔ تفریح نہیں کرتا پھرتا۔ یہ گھر، یہ گاڑی، یہ شان و شوکت میری دن رات کی محنت کا نتیجہ ہے۔ میں نے تمہیں پال پوس کر اس لیے بڑا کیا ہے کہ تم میرے سامنے اپنی مرضی چلانے لگو۔"

"[illegible] ہر کام آپ ہی کی مرضی سے ہوتا ہے۔" بیٹے نے [illegible] کرنے کی کوشش کی۔

"میں سب سمجھتا ہوں اور بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں، یہ سب تمہاری شہ پر ہو رہا ہے۔ اب تم جوان ہو گئے ہو نا۔"

"نہیں ڈیڈی، یہ بات نہیں۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں۔" وہ بھی زچ ہو گیا۔

"کیا سمجھانا چاہتے ہو تم مجھے۔ تمہارا باپ میں ہوں، تم میرے باپ نہیں ہو گئے۔ تمہارا یہ ٹھاٹ باٹ، یہ قیمتی لباس، یہ دولت کی فراوانی سب میرے دم سے ہے۔ مجھے یہ سب بیٹھے بٹھائے نہیں مل گیا تھا۔ تمہارے باپ کی طرح میرے باپ نے مجھے یہ سب سہولتیں نہیں دی تھیں۔ خون پسینہ ایک کیا ہے میں نے ان سب کے لیے۔"

"ان سب باتوں کا یہاں کیا مطلب؟" ماں نے باپ اور بیٹے کے درمیان تلخ کلامی کو ختم کرنے کی غرض سے بات ختم کرنا چاہی۔

"مطلب یہ بیگم صاحبہ کہ یہ اپنے آپ کو میری جگہ نہ سمجھے۔ ناز کو اداکاری کی اجازت تمہارے بیٹے نے دی تھی۔ یہ کون ہوتا ہے بھلا اجازت دینے والا۔ اور سن لو میاں تم بھی۔" اس نے بیٹے کو اشارہ کیا۔ "آج کے بعد میں تم میں سے کسی کو شوبزنس کی کسی فیلڈ میں نہ دیکھوں۔ ایک گھر میں ایک ہی فنکار کافی ہوتا ہے۔ تم لوگ کیا جانو شوبزنس کی فیلڈ باہر سے کیا ہے اور اندر سے کیا ہے۔" وہ اپنا بریف کیس اٹھا کر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلا گیا۔ کمرے میں تین افراد کے ہوتے ہوئے بھی گہری خاموشی طاری تھی۔ گویا تینوں ذی نفس مومی مجسمے ہوں جیسے کسی نے جادو کے زور سے جو جہاں تھا اسے وہیں ساکت کر دیا ہے۔ آخر خاموشی کی چادر کو ماں کی آواز نے توڑا۔

"سن لیا تم دونوں نے، میں نے پہلے ہی منع کیا تھا۔ تمہارا باپ کبھی تمہیں اس کام میں دیکھنا پسند نہیں کرے گا۔"

"سن لیا۔ شوبزنس کی دنیا باہر سے کچھ ہے، اندر سے کچھ۔" بیٹے نے تلخی سے ان سیڑھیوں کی طرف دیکھا جس پر ملک کا مایۂ ناز فنکار نہیں صرف ایک باپ چڑھ گیا تھا۔

"ڈیڈی تو خود اس بات کا ثبوت ہیں۔ ظاہر کچھ باطن کچھ۔ کون کہہ سکتا ہے ماما کہ یہ وہ شخص ہے جو روتوں کو ہنساتا ہے۔ گھر میں تو یہ شخص صرف رلاتا ہے۔" وہ جھٹکے سے اپنی جیکٹ اٹھا کر باہر چلا گیا۔

**

"کیا حال ہیں نفیس، ٹھیک ٹھاک؟" وہ گاڑی سے اترا ہی تھا کہ کسی نے اسے پیچھے سے مخاطب کیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ عزیز آفتاب کا دوست ٹی وی کا مشہور پروڈیوسر احسن عالم تھا۔

"جی بالکل ٹھیک۔ آپ کیسے ہیں؟" وہ خوش دلی سے ہنستا ہوا احسن کے ساتھ بینک کی عمارت میں داخل ہو گیا۔

"ارے ہم تو بالکل خیریت سے ہیں۔ تم سناؤ آفتاب کیسا ہے؟ لندن کا ٹور کیسا رہا۔ میں نے تو سنا ہے بڑا کامیاب شو کر کے آیا ہے۔"

"جی ہاں، بہت کامیاب۔" اس کی ہنسی بہت معنی خیز تھی۔

"ویسے یار میں نے تو آفتاب سے کئی بار کہا کہ تمہارا بیٹا تو تم سے بھی زیادہ ہینڈسم ہے۔ اسے کیوں آگے نہیں لاتے مگر وہ مانتا ہی نہیں۔" نفیس کی آنکھوں میں دو دن پہلے کا منظر گھوم گیا۔ "نفیس میں ایک سیریل کر رہا ہوں اور مجھے تم جیسا ہیرو چاہیے۔ اگر تم کہو تو میں آفتاب سے بات کروں اس سلسلے میں۔ تم تو بنے بنائے ہیرو ہو، رہ گئی اداکاری تو اکیڈمی تو تمہارے گھر میں ہی ہے۔ تمہیں بھلا کیا مسئلہ ہوگا؟" نفیس خاموشی سے

پوری بات سنتا رہا تھا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مجھے بھلا کیا مسئلہ ہوگا۔ لیکن میں فی الحال اس طرف آنا نہیں چاہتا۔ میں صرف اپنی اسٹڈیز پر کنسنٹریٹ کر رہا ہوں۔"

"ارے بھئی اسٹڈیز تو اس کے ساتھ بھی ہو سکتی ہے۔"

"نہیں، یہ بات نہیں۔ دراصل دو ایک سال بعد ایم بی بی ایس کر کے میں لندن ایف آر سی ایس کے لیے چلا جاؤں گا۔ اور ویسے بھی یہ صرف ڈیڈی کا شعبہ ہے۔ میرا کوئی اس میں انٹرسٹ نہیں۔" اس نے خشک لہجے میں بات کی وضاحت کی۔

"او کے۔ ایز یو وش۔ بٹ بیٹا جی جب بھی ایسا کرنے کا ارادہ کرو تو پہلے مجھے انفارم کرنا۔"

"آئی ایم شیور اباؤٹ اٹ۔ میں پہلے آپ کو ہی انفارم کروں گا۔" اس نے گرمجوشی سے احسن سے ہاتھ ملایا۔

اگر اس وقت عزیز آفتاب اپنے بیٹے کو بات کرتے سن لیتا تو بیٹے کی آواز کا اعتماد اسے بغاوت کی وہی آواز سنائی دیتا جو آج سے تیئیس سال پہلے اس نے اپنے باپ سے کی تھی۔ یہ کہانی شاید دوسری بار دہرائی جا رہی تھی۔

**

"سن رہی ہو تم سکینہ کی ماں۔" حافظ مولوی عبدالرحمٰن نے اپنی ٹوپی سر سے اتارتے ہوئے چارپائی پر بیٹھ کر بیوی کو مخاطب کیا۔ "تمہارا بیٹا فلموں میں اداکاری کرے گا۔"

ماں نے باورچی خانے کے دروازے سے جو آنگن میں کھلتا تھا، باہر کھڑے اونچے لمبے خوبصورت بیٹے کو نظر بھر کر دیکھا اور شاید نظروں میں ہی بلائیں لے ڈالیں۔

"سنا تم نے۔" ان کی آواز میں ناگواری کا عنصر نمایاں تھا۔ "اب یہ اداکاری کرے گا۔ گلوکاری کرے گا۔ حافظ عبدالرحمٰن کا بیٹا۔ حافظ مولوی رشید الزماں کا پوتا بھانڈ بنے گا۔ نام روشن کرے گا اپنے باپ دادا کا۔" ان کے چہرے کا سرخ و سفید رنگ دہکنے لگا۔

"ابا یہ کوئی غلط کام تو نہیں ہے۔" ضبط کرتے کرتے بھی اس کا لہجہ غصیلا ہو گیا۔

"نہیں بیٹے، یہ کب غلط کام ہے۔ غلط تو باپ تھا اور دادا تھا۔ تم تو نہایت درست ہو۔ تھیٹر میں تالیاں پیٹنا واقعی بہت اچھا کام ہے۔"

"ابا دنیا میں سیکڑوں لوگ یہ کام کر رہے ہیں آپ کو کیا پتا۔" اس نے دو بدو بحث کی۔

"ہاں میاں، دنیا میں سیکڑوں برائیاں ہو رہی ہیں مجھے کیا پتا۔ اس لیے کہ میں تو کنویں میں چھلانگ مارنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ مجھے بھلا کیا پتا ہوگا۔"

"ابا آپ سمجھتے نہیں۔ یہ وہ کام نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ میں ناچ گانا نہیں کر رہا۔ میں فنکار بننا چاہتا ہوں۔ دنیا میں فنکاروں کی بہت عزت ہوتی ہے ابا۔" عزیز نے کہا۔

"تم صحیح کہتے ہو بیٹے، دنیا میں اب عزت ان جیسوں کی ہی ہو گی۔ بھلا معلم دین ایک مدرس کی کیا حیثیت ان فنکاروں کے مقابلے میں۔"

حافظ صاحب کی بات نے اسے شدید کشمکش میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ پرانے خیالات کے ایک وضع دار آدمی تھے۔ اپنے باپ دادا کی طرح وہ اسے بھی حافظ نہ سہی لیکن درس و تدریس سے وابستہ دیکھنا چاہتے تھے لیکن بیٹا ان تمام باتوں سے الگ سوچ لے کر پیدا ہوا تھا۔ وہ فنکار بننا چاہتا تھا۔ جس خاندان نے کبھی فلم نہ دیکھی، وہ اس میں اداکاری کا خواہش مند تھا۔

"دنیا کہاں سے کہاں جا پہنچی ابا مگر آپ ابھی تک وہی پچاس سال پہلے والی دنیا میں آباد ہیں۔ فلم میں کام کرنا کوئی بری بات نہیں ہے ابا۔ میں کوئی چوری ڈاکا تو نہیں ڈال رہا، کسی دنگا فساد میں، کسی آوارہ گردی میں شامل نہیں ہونے جا رہا۔ فنکار بننا چاہتا ہوں۔ لوگوں کو خوشیاں دینا چاہتا ہوں، چھوٹی چھوٹی مسرتیں بانٹنا چاہتا ہوں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی آواز بلند ہوتی چلی گئی۔

"ارے میاں تم چوری ڈاکا بھی ڈال لو تو کیا ہے اب تم جوان ہو گئے ہو نا۔ باپ کے کاندھے جھک جائیں تو بیٹوں کی آواز بلند ہو ہی جاتی ہے۔" وہ ابا کی بات پر تڑپ کر رہ گیا لیکن باپ کی تڑپ کا اندازہ اسے کبھی نہ ہو سکا۔

"آپ کو تو میرا ہر کام غلط نظر آتا ہے۔ ٹھیک ہے اب میں اس وقت گھر میں آؤں گا جب آپ مجھے کبھی نہ کبھی صحیح تسلیم کر لیں گے اور میں خود کو صحیح ثابت کر دوں گا۔" وہ دندناتا ہوا آنگن سے نکل کر دروازے سے باہر جانے لگا تو ابا کی آواز کی بازگشت کافی دیر اس کا پیچھا کرتی رہی۔

"ہاں ہاں جاؤ۔ میں نے تمہیں اسی لیے پال پوس کر جوان کیا تھا کہ تم سہارا بننے کے بجائے مجھے آخری عمر میں ایک

ایکٹر کا باپ مشہور کر دو۔ حافظ عبدالرحمٰن ایک مسخرے کا باپ۔" ان کے لہجے میں زخمی شیر کی سی گرج تھی۔ دل ہلا دینے والی مگر شیر زخمی ہو تو صرف گرج سکتا ہے اور یہ بات وہ اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ تھک کر چارپائی پر گر سے پڑے۔

"آپ ہر بات دل کو کیوں لگا لیتے ہیں۔ جوان ہے، بہک گیا ہے۔ کچھ دن بعد سنبھل جائے گا۔" وفا شعار بیوی نے بیٹے کو جاتے دیکھا ضرور لیکن بیٹے کو روکنے کے بجائے شوہر کی دلجوئی کرنا اپنا فرض جانا۔

"نہیں سکینہ کی ماں۔ تم نے اُس کے لہجے کی تُندی اور تیزی کو محسوس نہیں کیا۔ وہ ایسا ضرور کرے گا۔ سکینہ کی ماں تمہارا جگر گوشہ کھوٹا نکلا۔" ماں کے چہرے پر سایہ سا آ کے گزر گیا۔

"آپ دل میلا نہ کریں۔ جو خدا کرے گا بہتر ہی ہوگا۔ میں اُسے سمجھاؤں گی۔"

"نہیں نہیں۔ وہ سمجھنے کی منزل سے بہت دور جا چکا ہے۔ آج میرا بیٹا مجھ سے زیادہ اونچی آواز میں بول کر گیا ہے۔ جب بیٹے اونچی آواز میں بولنے لگیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ ماں باپ اپنا دور ختم کر چکے۔ اب وہ اولاد کے رحم و کرم پر ہیں۔ اُن کی شرافت کے تاروں سے بُنی ہوئی عزت و آبرو کی چادر اولاد کی تیز آوازوں کے تیروں کی زد میں آ چکی ہے اور جب کبھی یہ تیر زبان کی کمان سے نکلیں گے تو عزت کی چادر تار تار ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔" حافظ صاحب کے کاندھے اور سر شدتِ غم سے کچھ اور جھک گئے۔

"سکینہ کی ماں اب وہ واپس نہیں آئے گا۔" ماں کا کلیجہ ہل گیا اور باپ کی آنکھ سے ایک آنسو نکل کر اُن کے دامن میں جذب ہو گیا۔

✽✽

گھر سے وہ نکل تو آیا لیکن یہاں آ کر اُسے پتا چلا کہ دھوپ بہت تیز ہے اور سایہ کہیں نہیں ہے۔ سائے کو تو خود ٹھکرا کر آیا تھا۔ اب یہ حال تھا کہ بھوک، واماندگی اور بے کاری نے اُسے کئی بار گھر جانے پر اکسایا مگر ابا کا سامنا کرنے کی اُس میں ہمت نہ تھی۔ وہ جب سے گھر سے آیا تھا، اُسے ناکامیوں کا سامنا تھا۔ جس ڈائریکٹر نے اُسے فلم میں کام کرنے کی آفر دی تھی، وہ اپنے وعدے سے مکر گیا اور نہ صرف وعدے سے مکر گیا بلکہ اُسے اپنے دفتر میں بھی گھسنے نہ دیا۔ اُسے اپنے وقت کا نامور ہیرو بننا تھا۔ عزیز عبدالرحمٰن کتنے ہی دفتر کے چکر لگاتا۔ ایک ایک پروڈیوسر کے پاس جاتا۔ کئی کئی گھنٹے ڈائریکٹروں کے گیٹ پر کھڑا رہتا۔ کبھی کسی سے کچھ کہتا، کبھی کسی سے چانس کی درخواست کرتا مگر سوائے ناکامیوں کے اُسے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ تھیٹر کی ایک دو چھوٹی چھوٹی آفرز سے ایک دو وقت کا کھانا میسر آیا لیکن اُسے اس کے بعد کہیں کام نہ ملا۔ حد تو یہ کہ اب دوست نے بھی مدد کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

اسی کشمکش میں وہ سڑک پر بنے فٹ پاتھ پر ایک کنسٹرکشن کمپنی کے دفتر کے سامنے بیٹھا اپنے ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں غور و فکر میں تھا اور اُس دن کو کوس رہا تھا جب اُس نے ماں باپ کا دل دکھایا تھا۔ بھوک سے اُس کے پیٹ میں گرہیں سی پڑ رہی تھیں۔ وہ سڑک پر آتے جاتے لوگوں کو بغور دیکھ رہا تھا کہ دفتر کا دروازہ کھلا اور کوئی باہر آ کر کھڑا ہوا۔ "سنو بھائی، میں تمہیں بہت دیر سے یہاں بیٹھا دیکھ رہا ہوں۔ کون ہو تم؟"

وہ گرمی کھایا ہوا تو تھا ہی تڑخ کر پلٹا۔ "میں یہاں صرف بیٹھا ہوا ہوں۔ تمہارا دفتر تمہارا ہے اور سڑک بلدیہ والوں کی۔ فٹ پاتھ پر اگر آوارہ کتے بیٹھ سکتے ہیں تو میں تو پھر بھی انسانوں میں سے ہوں۔ بے فکر رہو میں کوئی چور اُچکا یا اٹھائی گیر نہیں ہوں۔" آنے والا سکتے میں [illegible]

"میرا یہ مطلب نہیں تھا دوست۔"

"دوست؟" وہ پھر بھڑک اُٹھا۔ "میں کسی کا دوست نہیں، کوئی میرا دوست نہیں۔ تم کون ہوتے ہو مجھے بغیر اجازت دوست کہنے والے۔"

"بے کار بھی ہو اور بھوکے بھی ہو۔ گھر یا تو گئے نہیں یا ہے نہیں۔" آنے والے کے تجزیے نے اُسے [illegible] سا چز بز تو کر دیا۔ وہ شاید غضب کا چہرہ شناس تھا۔ اسی لیے اب کی بار وہ جواباً خاموش رہا۔ "آؤ اُٹھو میاں، بے رحم انسان ہو۔ مرد ہو، مرد کو مایوسی زیب نہیں دیتی۔ اُٹھو شاباش۔" آنے والے نے اُسے بازو سے پکڑ کر اُٹھایا اور اسی طرح بازو پکڑے پکڑے دفتر کے اندر لے گیا۔

اندر کوئی شاندار دفتر نہیں تھا۔ چند میزیں کرسیاں تھیں جن پر کاغذات کے فائل اور نقشہ جات وغیرہ

دھرے تھے۔ دفتر صاف ستھرا تھا اور وہ شاید اس وقت دفتر میں اکیلا ہی تھا۔ "بیٹھو۔" اُس نے عزیز عبدالرحمٰن کو کرسی کی طرف اشارہ کیا اور خود ملازم لڑکے کے پاس چلا گیا۔ وہ ایک کرسی پر جھکا ہوا بیٹھ رہا۔ اب اُس نے غور سے اُس کا جائزہ لیا۔ وہ جو کوئی بھی تھا صاف ستھرے لباس میں، سلیقے سے بال بنائے ہوئے، خوبصورت اور ذہین آنکھوں کے ساتھ اُس کے سامنے والی کرسی پر آ کر براجمان ہو گیا۔

"پہلے تو یہ بتاؤ تم کھاؤ گے کیا۔ میں تو مرچوں والا قیمہ لایا ہوں۔ اور پھر یہ بتاؤ تمہارا نام کیا ہے۔ میرا نام رضوان مہتاب ہے۔ میں اس کمپنی میں اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ ہوں۔"

"میرا نام عزیز..... عزیز آفتاب ہے۔ عزیز آفتاب۔" نہ جانے کیوں اُس نے اپنا نام بدل کر بتایا۔

"اوہ ویری نائس، یعنی تم آفتاب اور میں مہتاب، ویری گڈ۔ چلو ایک تعلق تو ہم میں نکل ہی آیا ناں۔ لو کھانا بھی آ گیا۔" اُس نے دیکھا ملازم لڑکا کھانے کی ٹرے اُٹھائے چلا آ رہا تھا۔ کھانے کو دیکھ کر اُس کی بھوک کچھ اور چمک سی گئی مگر وہ بہرحال ایک عزت دار باپ کا غیرت مند بیٹا تھا۔ ایسے کسی کی ہمدردی میں خیرات کا کھانا کھاتے ہوئے اُسے شرم سے پسینہ آنے لگا۔ رضوان اُس کی کیفیت کو بھانپ گیا تھا اسی لیے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے تسلی دیتے ہوئے کھانے پر راضی کرنے لگا۔ "دیکھو عزیز آفتاب تم جو کوئی بھی ہو۔ دنیا میں انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ آج میں تمہارے کام آیا کل تم اسی طرح کسی اور کے یا میرے ہی کام آ سکتے ہو۔ وقت کا پہیہ چکر میں رہتا ہے اور ہم سب اس پر سوار ہیں، اگر آج کوئی اوپر ہے تو اس نے نیچے بھی جانا ہے۔ اور جو آج نیچے ہے کل اُس نے اوپر بھی آنا ہے۔ تم آج کی بات کو وقت کا ایک امتحان سمجھ لو۔ کل جب تم کچھ بن جاؤ گے تو کسی اور کے ساتھ ایسا ہی سلوک کر لینا تمہارا حساب برابر ہو جائے گا سمجھے۔ چلو اب کھانا شروع کرو۔"

✽✽

اسے مہتاب کے ساتھ مفت کی روٹیاں توڑتے بہت سارے دن گزر گئے اور ہر روز جب مہتاب کے دفتر والے عملی کام پر نکل جاتے تو یہ خدائی خوار ہاتھ ہلاتا اُس کے پاس پہنچ جاتا اور وہ روز کی طرح اُس کے سامنے ٹفن کھول کر رکھ دیتا۔ اُس وقت عزیز کا دل چاہتا کہ ساری دنیا کو آگ لگا دے یا اپنا گلا گھونٹ ڈالے لیکن وہ کچھ بھی نہ کر پاتا۔ پیٹ کا دوزخ تو اُسے بھرنا ہی تھا۔ اُسے لگتا کہ وہ زنجیرِ فکر کی وہ کڑی ہے جو زندگی کی تمام حدت کے باوجود پگھلتی نہیں۔ نہ جانے قسمت اُس کے ساتھ کیسا کھیل کھیل رہی تھی۔ تھیٹر کے ایک دو پروگرام میں اُسے بہت چھوٹے چھوٹے چانس ملے وہ بھی کئی دن جوتیاں رگڑنے اور لاکھ منت سماجت کے بعد کسی نے اُس پر ترس کھا کر موقع دے دیا لیکن اس طرح تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

ایسا ہی ایک قسمت کا گرم ترین دن تھا جب وہ ایک فلم پروڈیوسر کے دفتر سے بے نیل و مرام باہر نکل آیا اور ہاتھ جھلاتا نیم پاگلوں کے سے انداز میں ایک تھیٹر کمپنی کے ہال تک پہنچ گیا۔ آج اسٹیج پر کسی بڑے فنکار کی گلوکاری کا مظاہرہ تھا۔ کئی بڑے لوگ وہاں پر انوائٹڈ تھے۔ ہال کے چپراسی کو اُس سے ہمدردی تھی۔ اُس کے توسط سے عزیز آفتاب ہال تک تو پہنچ ہی گیا۔ اُسے معلوم نہیں تھا اُس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ وہ ہال کے چند معمولی درجے کے ملازمین کے ساتھ جا کر کھڑا ہو گیا۔ تب اُسے پتا چلا کہ ابھی گلوکار کے آنے میں کچھ وقت باقی ہے۔ اور ہال لوگوں سے بھر گیا ہے۔ ایسے میں کسی ایسے چھوٹے فنکار کی ضرورت تھی جو پروگرام شروع ہونے تک لوگوں کو محظوظ کر سکے۔ یا کم از کم انھیں وقت گزرنے کا احساس نہ ہونے دے۔ پروگرام کا منتظم سخت پریشان تھا۔ اسی فکر میں وہ ملازمین کے گروپ کے قریب آیا تو وہاں کے لائٹ مین نے اُسے روک کر اُس کی توجہ عزیز آفتاب کی جانب دلائی۔ منتظم پہلے ہی سخت گھبرایا ہوا تھا۔ اُس نے پہلے تو سخت ناگواری سے ملازم کو دیکھا اور پھر عزیز آفتاب کی جانب متوجہ ہوا۔

"ہاں میاں، کیا کر سکتے ہو؟ کچھ دیر تک اسٹیج پر لوگوں کو مصروف رکھ سکتے ہو؟" اُس کے پوچھنے کا انداز ایسا تھا گویا اُسے اس بات کا یقین نہ ہو محض حجت تمام کرنے کی خاطر پوچھ لیا ہو۔ لیکن اندھا کیا چاہے دو آنکھیں اُس نے بغیر سوچے سمجھے اقرار کر لیا۔

"جی، جی ہاں، میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ اداکاری بھی اور تھوڑا بہت گا بھی سکتا ہوں اور تھوڑا بہت....."

"بس بس کافی ہے۔" منتظم نے ہاتھ اُٹھا کر اُسے روکا۔ "اگر تم کامیاب رہے تو میں تمہیں پانچ سو روپے سے

زیادہ ایک پیسہ نہیں دوں گا۔" پانچ سو روپے نے اُس کی آنکھیں کھول دیں۔
"مجھے منظور ہے۔" وہ جھٹ راضی ہو گیا۔
"تو بس ٹھیک ہے۔ پیچھے میک اَپ رُوم میں جا کر اپنا حلیہ درست کراؤ اور جاؤ اسٹیج پر جا کر جو کر سکتے ہو کرو۔" منتظم اُسے حکم دے کر چلا گیا۔
اس کے بعد اُسے پتا نہیں وہ اسٹیج پر کتنی دیر کیا کرتا رہا۔ اُسے تو بس اتنا پتا تھا کہ جب وہ اسٹیج سے اُترا تو تالیوں کی آواز اُس کے پیچھے سنائی دے رہی تھی اور فلم کا ایک مشہور و معروف ڈائریکٹر اُس کے سامنے کھڑا اُسے اپنی فلم میں اداکاری کی دعوت دے رہا تھا۔ اگر پیٹ کی یہ آگ اُسے زندگی کا پتا نہ دے رہی ہوتی تو وہ اُسے ایک خواب ہی سمجھتا۔ اُس نے کھوئے ہوئے ذہن سے ڈائریکٹر کی بات سنی۔ اُس کا پتا نوٹ کیا اور دوسرے دن اُس سے ملنے کا وعدہ کر کے پروگرام کے منتظم سے پانچ سو روپے لے کر نکلا تو اُسے لگا جیسے ہوا بہت خوشگوار ہو گئی ہے۔ لوگ مسکرا رہے ہیں اور پھول کھل اُٹھے ہیں۔ اُس کا جی چاہا، خوشی سے چیخے، چلائے، چھلانگیں مارے اور دنیا کو چلا چلا کر بتائے کہ آج اُسے منزل کا نشان مل گیا ہے جس پر وہ پہنچنا چاہتا تھا۔ آج اُس نے اپنے فن سے پانچ سو روپے کی خطیر رقم حاصل کی ہے اور بے تحاشا داد و تحسین سمیٹی ہے لیکن وہ یہ سب دل ہی دل میں سوچتا ہوا سڑک کے کنارے کنارے پیدل ہی چلتا گیا۔ ہوش آیا تو اُس وقت جب اُس نے دیکھا وہ مہتاب کے دفتر کے سامنے کھڑا ہے۔ مہتاب اُس کے بچپن کے دنوں کا ساتھی تھا۔ بلاشبہ اس خوش خبری کو سننے کا حق دار سب سے پہلے وہی تھا۔ آج وہ بے تکلف مہتاب کے آفس کے مینیجر کی موجودگی ہی میں اُس کے دفتر میں داخل ہو گیا۔ مہتاب اُسے اس طرح دیکھ کر تھوڑا سا حیران ہوا۔
"مہتاب ذرا اِدھر آؤ۔" مہتاب نے اُس کے خوبصورت چہرے کو غور سے دیکھا۔ خوشی کی سرخی اُس کے رخساروں کو نیا رنگ عطا کر رہی تھی۔ وہ کرسی چھوڑ کر اُس کے پیچھے پیچھے آ گیا۔
"یہ دیکھو۔" اُس نے جھٹکے سے اپنی مٹھی کھول دی۔ پانچ سو روپے اُس کی ہتھیلی پر رکھے تھے۔ "یہ روپے میرے فن کا پہلا نذرانہ ہیں۔ آج اسٹیج پر میں نے اپنی مرضی سے بہت دیر کام کیا۔ داد سمیٹی۔ ایک فلم ڈائریکٹر نے مجھے اپنی فلم میں ایک اہم کردار ادا کرنے کی آفر کی۔ میں نے لوگوں کو مسکراہٹیں دیں اور لوگوں نے مجھے داد دی، تالیاں بجائیں اور یہ پانچ سو روپے۔" اُس نے پانچ روپوں کو ایسے دیکھا جیسے وہ چند نوٹ نہ ہوں اُس کا سرمایۂ حیات ہوں، اُس کی منزل اُسے آواز دے رہی ہو۔
"مبارک ہو دوست، بہت بہت مبارک ہو۔" مہتاب نے اُسے خلوص سے گلے لگا لیا۔ "میں نہ کہتا تھا آفتاب اگر آج نہیں تو کل" تمہارا ضرور ہوگا۔ بس تھوڑا سا انتظار کرو۔"
اُس کی آنکھوں میں نئے دنوں کے چراغ جل اُٹھے۔
"ہاں یقیناً۔ مہتاب ایک بات کہوں مانو گے؟" وہ تھوڑا سا جھجک گیا۔
"ہاں ہاں کہو۔"
"آج تمہیں میں کھانا کھلاؤں گا۔" مہتاب بے ساختہ قہقہہ لگا بیٹھا۔
"کیوں نہیں، کیوں نہیں۔ صرف کھانا ہی نہیں تم مجھے مٹھائی بھی کھلاؤ گے اور دہی بڑوں کی چاٹ بھی میں کھاؤں گا۔ کہو منظور ہے؟"
"بالکل بالکل، آؤ ابھی چلتے ہیں۔" وہ خوشی و مسرت سے بے قابو ہوا اُٹھا۔

٭٭

مہتاب کے ساتھ کھانا کھانے کے بعد وہ دونوں شہر نوردی پر نکل کھڑے ہوئے۔ میکلوڈ روڈ، برنس روڈ، ایمپریس مارکیٹ، ٹاور اور نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھاننے کے بعد جب شام کی سیاہی ماحول پر حاوی ہو گئی تو اُس کے دل پر بھی اندھیرا سا چھانے لگا۔ وہ بے پناہ خوشی و مسرت کے باوجود ایک کسک، ایک چبھن اپنے دل سے نہ نکال سکا۔ اور شام ڈھلتے اس چبھن کو برداشت کرنے کا اُس میں یارا نہ رہا۔
"مہتاب۔" وہ دونوں سگریٹ پان کے کھوکے سے ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ مہتاب سگریٹ کا دھواں اُڑا رہا تھا۔ اُسے مہتاب کی یہی ایک بات ناپسند تھی لیکن آج اُس نے اُسے ٹوکا نہیں۔
"ہاں بولو۔" مہتاب نے خود ہی سگریٹ بجھا کر ہوا میں اُچھال دیا۔
"مہتاب آج میں تم سے اپنی زندگی کا وہ راز بانٹنے جا رہا ہوں جو کسی تیسرے تک کبھی نہیں پہنچے گا۔" اس کے بعد وہ کافی دیر خاموش کھڑا رہا گویا الفاظ کو کچھ ترتیب

دے رہا ہو۔ "مہتاب تم ..... تم میرے ساتھ میرے گھر چلو گے اُس گھر میں تمہیں ایک بوڑھا شخص ملے گا۔ زبان اور کردار کا غازی۔ سفید داڑھی اور سفید لباس میں۔ اور ایک بوڑھی عورت بھی جس کی تم صرف آواز سن سکو گے۔ اور شاید اُس کا چادر سے ڈھکا پُرشفقت ہاتھ اپنے سر پر محسوس کر سکو گے اور کچھ بچے ملیں گے۔ مہتاب وہ عورت میری ماں ہو گی اور وہ بوڑھا جو ایک گرتی اور سسکتی ہوئی تہذیب کا پروردہ ہے، میرا باپ ہو گا۔ تم یہ روپے۔" اُس نے چار سو روپے مہتاب کی مٹھی میں بند کر دیے۔ "یہ روپے انھیں دے دینا۔ کسی حوالے سے بھی یہ روپے اُن تک پہنچا دینا۔" اُس کے لہجے کی بے بسی اُس کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے جگنو مہتاب کے لیے حیران کن بھی تھے اور تکلیف دہ بھی۔ اُس نے روپے لے تو لیے لیکن سوال اُس کی نظروں سے ہٹ نہ سکا کہ ماں باپ اپنے بیٹے کی کمائی اُس کے ہاتھ سے کیوں نہیں لیں گے۔
"میرا باپ حافظِ قرآن ہے۔ معلمِ دین ہے۔ مدرس ہے۔ کئی پشتوں سے ہم علم بانٹتے چلے آ رہے ہیں۔ بس ایک میں راندۂ درگاہ بدنصیب اس منزل تک نہ پہنچ سکا۔ مہتاب میں حافظ عبدالرحمٰن کا بیٹا ہوں جن کی قرأت سن کر لوگوں کو وجد آ جاتا ہے۔ بیمار کو قرار آ جاتا ہے بیزار کو سکون آ جاتا ہے۔ بے چین روحوں کو تسکین ملتی ہے۔ بس ایک میں نہ جانے کیسی بے چین روح تھا جسے کہیں قرار نہ ملا۔ اور میں دھوپ میں بھٹکنے کے لیے گھر سے نکل آیا۔ اپنی جنت کو چھوڑ کر۔" وہ سر جھکائے گلیوں گلیوں گزرتے چلے گئے۔ کتنے لوگ اُن کے پاس سے گزرے کسی نے پلٹ کر دیکھا کہ اُن کے پیچھے کون خوش قسمت بدنصیب گزر کر گیا ہے۔
"تم ساری زندگی یہ راز اپنے تک رکھو گے بلکہ اپنے آپ سے بھی چھپا کر رکھو گے کہ عزیز آفتاب کسی حافظ عبدالرحمٰن کا بیٹا ہے۔ عزیز آفتاب صرف عزیز آفتاب ہے۔ تھیٹر کا اداکار، فلم کا ایکٹر، اسٹیج کا مسخرہ عزیز آفتاب اور بس۔" اس کی آواز رندھ گئی۔ حلق میں کہیں آنسوؤں کا گولا پھنس کر رہ گیا تھا۔ وہ خود شناسی کے کرب سے گزرا تھا۔
رضوان مہتاب واقعی مہتاب ثابت ہوا۔ اُس کی زندگی کی اندھیری رات میں روشنی کا اکلوتا سفیر، جس کی ٹھنڈی میٹھی چاندنی نے اُسے راستہ دکھایا۔ اُس نے مہتاب سے جو وعدہ مانگا تھا، وہ لفظوں کا محتاج نہیں تھا کیونکہ لفظ بعض اوقات پانی پر گرنے والے پانی کے ہی قطروں کی طرح ہوتے ہیں۔

٭٭

وہ دونوں گلی کے نکڑ پر کھڑے گلی کے اندر جھانک رہے تھے۔ کم حیثیت لوگوں کا محلہ لوگوں کے قدموں کی چاپ سے ابھی تک زندہ تھا۔ بچوں کے کھیل کی صدا گلی کے کونے تک آ رہی تھی جہاں کھمبے پر لگے بلب کی زرد روشنی کے ہالے میں سے اُس نے مہتاب کو اشارہ کر کے اپنے گھر کا پتہ سمجھایا۔ مہتاب جلدی سے گلی میں داخل ہو گیا۔ اُس نے کوٹ کا کالر سیدھا اور اوپر تک کر رکھا تھا اور سر سے گردن تک مفلر لپیٹ رکھا تھا۔ مہتاب کو اُس نے ایک ہوٹل پہنچنے کی ہدایت کی تھی لیکن اب مہتاب کو گئے دس پندرہ منٹ گزر گئے تھے۔ وہ ایک قدم نہ اُٹھا سکا۔ زمین نے گویا اُس کے قدموں میں گڑ کر اُسے روک لیا۔ آخر اس گلی میں اُس نے اپنے بچپن سے اب تک کا سفر طے کیا تھا۔ گلی کے کونے کے سامنے والے حصے میں دور اسکول کی سوئی ہوئی عمارت اور بائیں ہاتھ پر گھروں کے اوپر سے جھانکتے ہوئے مسجد کے مینار مہربان ماں کے بازوؤں کی طرح کھلے ہوئے تھے جو اپنے نافرمان بچوں کو بھی گلے سے لگا لیتی ہے۔ یہ وہی مسجد تھی جس میں اُس کے باپ کی قرأت سن کر اہلِ محلہ اپنے ضروری کام کاج چھوڑ کر مسجد کے صحن میں اکٹھے ہو جاتے تھے اور آج وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اُسے دیکھ کر پہچان لے اور حیران ہو کر حافظ عبدالرحمٰن کا بیٹا اس حلیے میں بھی ہو سکتا ہے۔
ابھی وہ اپنی سوچوں میں غلطاں کھمبے سے ٹیک لگائے واپس جانے کی فکر میں تھا کہ اُس نے ننھی کو گلی کا موڑ مڑتے دیکھا۔ ننھی چھوٹے سے دوپٹے کو کندھوں پر پھیلائے دو چوٹیاں ہلاتی بھاگی بھاگی محلے کے اکلوتے مشہور جنرل اسٹور کی طرف جا رہی تھی۔ وہ بے قرار ہو کر اُسے آواز دے بیٹھا۔ ننھی نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا
ننھی حیران تھی۔ "عزو بھیا، عزو بھیا۔"
"ننھی امی کیسی ہیں؟" اُس نے اشتیاق سے پوچھا۔
"امی ویسی ہی ہیں۔"
"اور، ابا..... ابا کیا کر رہے ہیں؟"
"ابا لیٹے ہوئے ہیں۔"
"حفیظ کہاں ہے اور راجا کیا کر رہا ہے؟"
"راجا بھیا پڑھ رہے ہیں اور حفیظ بھیا گئے ہوئے ہیں۔"

ننھی نے ہر سوال کا اپنی دانست میں مکمل تسلی بخش جواب دیا۔ چار سال کی ننھی بھلا کتنا سمجھتی۔ "عزتو بھیا آپ بہت گندے ہیں۔ آپ میری گڑیا بھی نہیں لائے اور گھر بھی نہیں آئے۔"

"میں گڑیا ضرور لاؤں گا میری گڑیا۔" اس نے ننھی سی گڑیا کو اپنے بازوؤں میں چھپا لیا۔ "اب تم جاؤ اور یہ لو ایک روپیہ۔" اس نے جیب سے روپیہ نکال کر اسے دیا۔

"اور تم جا کہاں رہی تھیں؟" اچانک اسے خیال آیا۔

"بسکٹ لینے، مہمان آئے ہیں ناں۔ اماں ان سے باتیں کر رہی ہیں۔" اسے اچنبھا ہوا اماں اور مہتاب سے باتیں کر رہی ہیں۔ وہ تو پردے کی نہایت سخت خاتون تھیں لیکن پھر وہ اسے ننھی کی ناسمجھی جان کر نظر انداز کر گیا۔

"اچھا ٹھیک ہے جاؤ اور دیکھو کسی سے کہنا نہیں کہ میں آیا تھا ورنہ دیکھو میں تمہاری گڑیا نہیں لاؤں گا۔" ننھی اسے دیکھتی ہوئی چلی گئی تو وہ بھی تیز تیز قدم اٹھاتا اپنے مقررہ ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔

٭٭

اس کے ہاتھ سے کھانے کا چمچ نیچے گر پڑا۔ اس کا دل چاہا یہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ تو یہ تھی دل کی وہ تڑپ جسے وہ کوئی نام نہ دے سکا تھا۔ مہتاب کے آنے کے بعد وہ ایک ایک کے بارے میں پل پل کریدتا رہا تھا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ اس کے ماں باپ نے اس کے بھیجے ہوئے روپے رکھ لیے ہیں۔ اس نے اماں کا پوچھا۔ ابا کا پوچھا۔ کون کون آیا۔ کس کس نے اس سے کیا بات کی۔

"مجھے حیرت ہے مہتاب، اماں نے تم سے سامنے بیٹھ کر بات کی۔ اماں تو کبھی کسی کے سامنے نہیں آئیں۔"

"انھوں نے نہ صرف مجھ سے بات کی بلکہ مجھے گلے لگا کر سر پر ہاتھ پھیر کر رخصت کیا۔" مہتاب از حد سنجیدہ تھا۔

"اچھا! اور کیا کہا۔ اماں تھیں کیسی۔ مہتاب تم بتاتے کیوں نہیں؟"

"آفتاب، اماں خیریت سے ہیں لیکن تم اپنے آپ پر قابو رکھو تو میں تمہیں اصل بات بتا دوں۔"

"اصل بات۔" اس کا دل دھڑک اٹھا۔

"ہاں، بات دراصل یہ ہے کہ تمہارے ابا بہت بیمار ہیں۔ انھیں ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔" اس کی نظریں مہتاب کے چہرے پر جا کر ٹک گئیں۔ ہاتھ پیروں سے تو اس کے یہ بات سن کر جان نکل گئی تھی لیکن اگلا جملہ سن کر اس کے ہاتھ سے کھانے کا چمچ نیچے گر پڑا تھا۔ "اور اب آفتاب ان پر فالج گر پڑا ہے۔ وہ نہ صرف چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے ہیں بلکہ ان کی زبان میں انتہا درجے کی لکنت آ گئی ہے۔" اس کا دل چاہا یہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ وہ مہتاب سے کہنا چاہتا تھا۔ فالج ابا پر نہیں اس پر گرا ہے۔ مہتاب کا سر جھکا ہوا تھا۔ اسے آنکھ سے نظر ملا کر تفصیل بتانے کی ہمت نہ ہوئی۔ "شکر ہے کہ ان کی جان بچا لی گئی لیکن پچھلے کئی مہینوں سے تمہارا گھر کا کوئی پرسانِ حال نہیں تمہارے دونوں بھائی الگ ہو چکے ہیں۔ جو کچھ رقم اماں نے پس انداز کی تھی وہ حافظ صاحب کے علاج پر خرچ ہو گئی ہے۔ باقی کا علاج معالجہ، گھر کا خرچہ، روٹی کپڑا۔۔۔ اور دیگر ضروریات کے لیے تمہاری والدہ شاید کچھ سلائی کڑھائی وغیرہ کرنے لگی ہیں۔"

"بس کرو مہتاب۔ بس کرو۔ میرا دل بند ہو جائے گا۔" وہ درد کی شدت سے کرسی پر دہرا ہو کر رہ گیا۔ بہت دیر وہ میز پر سر رکھے بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ "[illegible] کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" اپنے کاندھے پر مہتاب کے ہاتھ کا لمس محسوس کر کے وہ سسک اٹھا۔ "وہ مجھ سے خفا ہو کر مجھے ڈانٹ لیتے، مار لیتے، مگر اتنی بڑی سزا تو نہ دیتے۔ مہتاب وہ صرف میرے ابا تو نہ تھے۔ میرے دوست بھی تھے۔" وہ میز پر سر رکھے آنسو بہاتا رہا۔

ہوٹل میں چلتے ہوئے ریڈیو میں سے آتی ہوئی [illegible] خان کی آواز وہاں شاید صرف ایک آدمی ہی سن رہا تھا۔

میرا قبلہ و کعبہ، مسجد و منبر، دین بھی تو ایمان بھی تو
میرا عشق بھی تو میرا یار بھی تو۔۔۔

مہتاب کو گیت کے بولوں کی تشریح اچھی طرح سمجھ آ چکی تھی۔

٭٭

"مہتاب، تم مجھے کوئی نوکری دلوا دو۔"

"مثلاً کیا نوکری تم کر سکتے ہو۔ بقول تمہارے تم نے ایف اے تک پڑھا ہے لیکن تمہارے پاس کوئی ثبوت وغیرہ تو موجود ہے نہیں۔ میں کسی سے کہوں بھی تو کس بنیاد پر؟" مہتاب نے قلم ہاتھ سے رکھ کر اسے دیکھا۔

"کوئی بھی کہیں بھی۔" وہ مُصر تھا۔

"لیکن کیوں۔ وہ جو قلم [illegible] ملا تھا اس [illegible]

کہا۔ میری مانو تو تم فنکاری ہی کرو۔"

"چھوڑو اس بات کو۔" اس نے کہا۔ "اب میں نوکری کرنا چاہتا ہوں۔ آخر اب گھر کی ذمے داری میری ہی تو ہے اور کون اسے اٹھا سکتا ہے۔" اس کے چہرے کا سرخ و سفید رنگ کچھ مزید سرخ ہو گیا۔ اچانک اسے کچھ یاد آ گیا۔ "مہتاب! ابا کے علاج کا خرچہ کس نے دیا تھا پہلے؟"

"سکینہ آپا کے میاں نے!" ایک اور بوجھ اس کے دل پر آ پڑا۔ ابا ان لوگوں میں سے تھے جو ہمیشہ بیٹی کے گھر آنے یا اس کے گھر جانے پر کوئی سوغات ضرور دیتے ہیں، نہ کہ لیتے ہیں۔ اور اب اسی بیٹی نے ان کے علاج کا خرچہ اٹھایا تھا۔ ابا پر فالج نہ گرتا تو کیوں نہ گرتا؟ وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔

مہتاب اس کی پشت دیکھتا رہا۔ اس کا جی چاہا اس سے پوچھے کہ تمہیں وہ دو سیاہ ہنستی آنکھیں یاد نہیں۔ تم نے پوچھا تو سب کہا، اور اگر نہ پوچھا تو اس کا جو اپنا تن من جلائے تمہارے ماں باپ کا سہارا بنی ہوئی ہے۔ لیکن وہ بولا نہیں۔ وہ دوست ہی کیا جو زخم پر چرکے لگائے۔ "وہ سلائی کڑھائی سے کیا ملتا ہو گا۔ باقی گھر کا خرچہ بھی ادریس بھائی ہی دیتے رہے ہوں گے۔" وہ گویا آنسوؤں کی تہہ میں سے بولا۔

"نہیں۔ وہ بے چارے اپنے بچوں کا پیٹ پال لیتے ہیں یہ بھی کافی ہے۔ جتنا ان کے بس میں تھا انھوں نے کر دیا۔" مہتاب کو اس کے چہرے سے پتا چل گیا تھا کہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔

"تمہیں کوئی یاد ہے۔ کوئی اور۔" اس نے "اور" پر زور دیا۔ آفتاب کے ذہن میں روشنی کا جھماکا سا ہوا۔

"صبیحہ۔" مہتاب نے تصدیق میں سر ہلا کر اسے غور سے دیکھا۔ حیرت، استعجاب، پشیمانی یا غصہ۔ وہ اس کے تاثرات کو کوئی نام نہ دے سکا۔

"پچھلے پانچ مہینے سے وہ نہ صرف ایک اسکول میں نوکری کر کے تمہارے گھر والوں کو خرچہ دے رہی ہیں بلکہ تمہاری والدہ کے ساتھ ان کے کام میں ان کا ہاتھ بھی بٹا رہی ہیں۔ دراصل وہ ہی ایک واحد ہستی ہیں جنھیں میں نے تمہارے پیسوں کے اصل ذریعے کے بارے میں صحیح بتایا تھا ماں اور ابا سے تو میں نے صرف یہ کہا تھا کہ تم میری ہی کمپنی کے دوسرے دفتر میں ملازم ہو گئے ہو اور دوسرے شہر چلے گئے ہو۔"

"صبیحہ اماں کے ساتھ رہ رہی ہے۔"

"ہاں۔" مہتاب کی نظروں میں چادر اوڑھے کالی آنکھوں والی، دھیمے لہجے میں بات کرنے والی بردبار سی لڑکی گھوم گئی۔ اس نے اپنے دل و دماغ کو شدت سے ڈانٹا۔

"کیا میں تمہیں بتاؤں کہ وہ کون ہے؟" نہ چاہتے ہوئے بھی مہتاب نے نگاہ اٹھا کر آفتاب کو دیکھا اور شاید پہلی بار اس کی نظر نے اس راز کا انکشاف کیا جو وہ اپنی زبان سے کبھی نہ کہتا۔ "وہ میری منگیتر تھی، مہتاب۔" اس نے بطورِ خاص مہتاب کا جائزہ لیا۔

"حواسوں میں ہو تم۔" اس کے چہرے کا رنگ تو ضرور بدلا لیکن وہ بھی مہتاب تھا، اس کی دوستی کا دعویدار، اسی لیے اس نے اسے ڈپٹ دیا۔ "تم جانتے ہو وہ صرف تمہاری منگیتر ہی نہیں، تمہارے بہنوئی کی بہن بھی ہے خواہ رشتے ہی کی سہی، اور بقول تمہاری والدہ کے کہ وہ سکینہ آپا کو بھی بے حد عزیز ہے، تمہارے حوالے سے۔"

"وہ مجھ سے منسوب تھی جب میں عزیز عبدالرحمٰن تھا۔" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اور یاد رکھنا مہتاب، عزیز آفتاب اس کے لائق نہیں۔ وہ خلوص کے جس مقام پر جا پہنچی ہے اس کے لائق تو کوئی اس جیسا ہی مخلص اور بے غرض آدمی ہی ہو سکتا ہے، ایسا جو اپنے ٹفن کا آدھا کھانا کسی اور کو کھلاتا رہا ہو۔" اس سے پہلے کہ مہتاب کچھ کہتا اس نے ہاتھ اٹھا کر فیصلہ دے دیا۔ "اور اب یہ بات طے ہے مہتاب کہ میں تھیٹر کا اداکار ہی بنوں گا اور تم جو کہانی میرے گھر سنا کر آئے ہو، ساری زندگی یہی کہانی سناتے رہو گے اور اس کہانی میں رنگ بھرنے کے لیے تمہیں جو ساتھی چاہیے تھا وہ تمہیں مل چکا ہے۔ میں ساری زندگی اپنے دونوں کاندھوں پر دو پیارے اور مخلص دوستوں کا ہاتھ محسوس کرتا رہوں گا کیونکہ ایسا ہی ہو گا ناں۔"

مہتاب شاید پہلی بار اس کے سامنے لاجواب ہوا۔ وہ تو پہلے ہی دن آفتاب کی والدہ سے یہ ساری بات سننے کے بعد اس کالی آنکھوں والی لڑکی کے لیے اپنی زندگی ہار آیا تھا۔ اس لڑکی کی معصومیت، اس کا اندازِ گفتگو اسے رہ رہ کر یاد آتے۔ وہ جتنا بھلاتا وہ اتنی ہی یاد آتی۔ اسے تو اندازہ بھی نہیں تھا کہ اس کے خلوص کا اسے اتنا بڑا صلہ ملے گا۔ وہ بغیر ایک لفظ کہے آفتاب سے لپٹ گیا۔

٭٭

"وقت کا کام گزرنا ہے، گزر جائے گا۔"

عزیز آفتاب کے لیے تھوڑا بہت نہیں پچیس سال کا طویل عرصہ گزر گیا۔ پچیس سال پہلے جس عزیز آفتاب نے ایک فلم میں کام کرنے کی ہامی بھری تھی، آج اس کا فنی سفر فن کی دنیا میں ایک روشن اور تابندہ مثال تھا۔ اس کی پہلی فلم اگرچہ بہت کامیاب نہ ہو سکی لیکن اس فلم سے ایک ایسے فنکار نے جنم لیا جسے بعد میں ملک کے کامیاب ترین فنکار ہونے کا اعزاز حاصل ہوا جس کا نام کسی بھی شو کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جانے لگا۔ اس نے اپنے وقت کے بہترین کردار ادا کیے۔ اس کی صداکاری اور مکالمہ کاری کو بھی دنیا نے تسلیم کیا۔ اس نے اپنے لفظوں سے دنیا کو ہنسایا بھی اور رلایا بھی۔ وہ دنیا کے لیے ایک لاجواب فنکار تھا۔

لیکن آج پچیس سال بعد بھی ملک کا نامور فنکار اپنی اولاد کے لیے فن کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ بن گیا تھا۔ جس فنکار کو ملک کا بچہ بچہ جانتا تھا، وہ اپنے کسی انٹرویو میں اپنے گھر، اپنی بیوی اور بچوں کے متعلق کبھی گفتگو نہ کرتا۔ اس کے گھر والوں کو معدودے چند افراد کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔ شوبزنس کا کوئی صحافی کبھی اس کے گھر نہیں گیا۔ اسی لیے کسی کو اس بات کا کبھی پتا نہ چلا کہ ملک کا یہ نامور فنکار اپنی ہر کامیابی کے بعد، اپنے ہر کامیاب غیر ملکی دورے کے بعد ملک کے ایک مشہور و معروف ہوٹل کے کسی غیر معروف کمرے میں ٹھہرنے والے ایک غیر معروف آدمی سے ملنے جاتا ہے۔ کمرے کا دروازہ، کمرے میں موجود شخص کے بازوؤں کی طرح کھلا ہوا ہوتا ہے۔

آج بھی ہوٹل ہالیڈے اِن کے کمرہ نمبر ۱۲ میں رات کے ایک بجے وہ دستک دیے بغیر بلا جھجک داخل ہو گیا۔ کمرے میں موجود شخص اس کا قریب ترین دوست رضوان مہتاب ہی تو تھا جو پچھلے پچیس سال سے اس کی دی ہوئی رقم اس کے والدین تک پہنچاتا رہا تھا۔ "تم بیٹھو یہاں میں چائے منگواتا ہوں۔"

"چائے نہیں، میں کھانا کھاؤں گا۔" ہمیشہ کی طرح اس نے بیڈ پر دراز ہوتے ہوئے مہتاب کو اشارہ کیا۔ مہتاب نے انٹرکام پر روم سروس کو آرڈر دیا اور اس کے پاس ہی آکر بیٹھ گیا۔

"تمہارے لیے ایک گڈ نیوز ہے۔" وہ مکمل طور پر متوجہ تھا۔ "اباجی کی زبان میں کافی فرق آ گیا ہے۔ کچھ دن پہلے صبیحہ گئی تھی، اماں سے ملنے تو اباجی نے اس سے کافی گفتگو کی تھی۔"

"کیا واقعی؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"ہاں واقعی، اور یہ سب اس مسلسل علاج کی بدولت ممکن ہوا جو تم ان کا کرواتے رہے ہو اور وہ سمجھتے ہیں میں کروا رہا ہوں۔" اس کا لہجہ آخری جملے پر کچھ بوجھل سا ہو گیا۔ "آفتاب، تم ابا سے مل کیوں نہیں لیتے۔ آخر یہ کیسی ضد ہے تم باپ بیٹے میں۔" ہر ملاقات پر وہ دونوں اسی مسئلے پر بحث کرتے اور وہ ہر دفعہ اسے یہ کہہ کر منع کر دیتا کہ، ابھی وقت نہیں آیا۔

"نہیں مہتاب، ابا کے دل میں میرے لیے قطعی گنجائش نہیں ہوگی۔ میں اپنے باپ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔" وہ شکست خوردہ سا تھا۔

"لیکن پچھلے کئی برسوں سے تمہارے باپ کو میں دیکھتا آیا ہوں۔ آفتاب باپ کا دل اپنے بیٹے کے لیے کیسے سخت ہو سکتا ہے بھلا۔ اور وہ تو سراپا محبت ہیں۔ میں اب بھی کہتا ہوں تم ان کے سامنے جاؤ گے تو وہ تمہیں معاف کر دیں گے۔ آخر تم ان کے بیٹے ہو۔ ان کا خون ہو۔"

"انہیں اپنی اولاد سے زیادہ اپنی عزت عزیز ہے اور مجھے ان کی عزت اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔"

"صبیحہ ٹھیک کہتی ہے۔ تم دونوں اپنی اپنی انا کے خول میں بند ہو کر ایک ایسی ہستی کو پیس رہے ہو جو ایک کی ماں اور ایک کی بیوی ہے۔" مہتاب کو اس پر غصہ آ گیا۔

"کیا ہوا اماں کو، ٹھیک تو ہیں وہ۔" ماں کے ذکر پر وہ تڑپ اٹھا۔

"ہاں ٹھیک ہیں۔ کچھ دن پہلے بیمار ہو گئی تھیں، اب بہتر ہیں۔" دروازے پر دستک ہوئی تو مہتاب نے ٹرالی ویٹر سے لے کر خود ہی اندر کر لی اور ویٹر کو باہر سے ہی واپس کر دیا۔

"صبیحہ کیسی ہیں؟" مہتاب سے شادی کے بعد اس نے صبیحہ کو بھابی کہنا چاہا لیکن مہتاب نے اس کے نام پر ہی اصرار کیا۔ لیکن اب وہ ہمیشہ اس کا ذکر احترام سے ہی کرتا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ ہماری بیٹی کا نہیں پوچھو گے۔ تمہاری سب سے بڑی فین تو وہی ہے۔ دوستی ہو گئی ہے اس کی

ناز آفتاب سے بھی مل لینا، اگر دماغ سے بھوت اتر جائے تو۔" وہ دونوں ہی ہنس پڑے۔

"تو آخر ان کی دوستی ہو گئی جو ہونی ہی تھی۔"

"ہاں ناز کو تم نے اس کے ہی کالج میں داخل کرایا تو کیسے ممکن تھا کہ جس کے باپ کو اس کے پاپا بے انتہا پسند کرتے ہیں، وہ اس کی بیٹی سے دوستی نہ کرتی اور غالباً ان کے مزاج بھی ایک جیسے ہیں اور شوق بھی لیکن ٹھہرو تم نے اس کی گھر کی تصویریں تو دیکھی ہیں۔ آج میں [illegible] کو تمہیں دکھاتا ہوں۔" وہ اٹھ کر سائڈ ٹیبل کی دراز سے کچھ نکالنے لگا۔ یہ ایک وڈیو کیسٹ تھا۔ "بیٹی اگرچہ وہ ہماری ہے لیکن میرا خیال ہے، مجھے اور صبیحہ کو تم سے اتنی محبت تھی کہ ہماری بیٹی تمہارے جیسے شوق لے کر پیدا ہوئی لیکن تمہاری طرح ہم اپنی بیٹی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنے کہ وہ دن کا شوق بھی پورا کر لے۔" وی سی آر میں کیسٹ ڈالتے ہوئے اس نے شرارت سے آفتاب کو دیکھا جو اس کی بات پر خاصا حیران تھا۔

"کیا مطلب، یعنی کہ رابعہ کچھ اداکاری وغیرہ میں انٹرسٹڈ ہے۔"

"ہاں بھئی، آخر کو چچا کا اثر کسی میں تو آنا تھا۔" وہ بے ساختہ قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ ٹی وی پر ڈراما شروع ہو چکا تھا۔

دربار شاہانہ، تخت و تاج، خدام اور کنیزیں قطار اندر قطار سر جھکائے دست بستہ خدمت شاہ میں موجود تھے۔ شاہ اکبر تخت پر جلوہ فرما تھے۔ مقدمہ انارکلی پیش تھا۔ اکبر کے ساتھ بیٹھی ہوئی ملکہ آفتاب کی بیٹی ناز آفتاب تھی اور پھر اسکرین پر رابعہ نظر آئی۔ مہتاب نے ٹی وی اسی منظر پر روک دیا۔ آفتاب کو لگا وقت کا پہیہ الٹا چل پڑا ہے۔ وہی سیاہ بھونرا سی آنکھیں، ویسی ہی ناک، ویسے ہی تیکھے ابرو اور دل میں اتر جانے والے نین نقش جو اس کی ماں کا خاصہ تھے۔ پانچ سال پہلے والی بچی میں اور اسکرین پر نظر آنے والی رابعہ رضوان میں زمین آسمان کا فرق لگ رہا تھا۔ اس پر اس کا مغلیہ طرز کا لباس، وہ ہوبہو اپنی ماں صبیحہ کا دوسرا روپ تھی۔ اس کے دل کی دنیا تہ و بالا ہو کر رہ گئی۔ اس نے پہلی بار صبیحہ کو ایسے ہی لباس میں دیکھا تھا۔

"مہتاب ہماری رابعہ کو تو خدا نے بڑی فرصت میں بنایا ہو گا۔"

"ہاں لیکن جتنی فرصت سے اس کی ماں کو خدا نے بنایا، اتنی فرصت سے پھر بھی نہیں۔" مہتاب نے دوبارہ ریموٹ پر پلے کا بٹن پریس کر دیا۔ "اور یہ ہے ہماری بیٹی ناز آفتاب، جس کا باپ اس کے معصوم سے شوق پر اسے اتنا ڈانٹتا ہے کہ وہ شکایت تک نہیں کر پاتی۔"

مہتاب نے دوستی کا حق پھر استعمال کیا۔ آفتاب کو ذرا سی پشیمانی کا احساس ہوا۔ وہ واقعی اپنے بچوں پر زیادتی کر رہا تھا۔ "نہیں مہتاب۔ یہ بات نہیں میرے دوست تم سے کیا چھپا ہے۔ تم تو میری ان باتوں سے بھی واقف ہو جو خود میں بھی نہیں جانتا۔ میں اپنے بچوں کو اس جہنم میں کیسے جھونک دوں جس میں میں خود جلتا رہا ہوں۔ تمہیں نہیں پتا شوبزنس کی دنیا صرف چڑھتے سورج کی پجاری ہے۔ یہ بہت خود غرض اور مطلبی دنیا ہے۔ جو فنکار جب تک عروج میں رہتا ہے دنیا اس کے پیچھے پیچھے بھاگتی ہے اور جب اس کا وقت ختم ہونے لگتا ہے تو جانتے ہو مہتاب، تنہائی کا ایک بہت گہرا سمندر فنکار کو نگل لیتا ہے۔" اس کے اندر کا کرب ایک بار پھر جاگ اٹھا۔ "شہرت کے بعد کی گمنامی بہت اذیت ناک، بڑی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ لوگ بھول جاتے ہیں کہ کبھی کوئی پہلے بھی ان راستوں سے گزرا ہے۔ وہ تو بس ہر نئے چمکتے دمکتے ستارے کی طرف لپکتے ہیں۔ ٹوٹتا ہوا ستارہ اور بجھتا ہوا چراغ بھلا کسی کو کب اچھے لگتے ہیں۔ میں نے اس دنیا کو بہت اندر تک دیکھا ہے۔ میں اس اذیت سے اپنے بچوں کو کیسے دوچار کر دوں مہتاب، اب میں بھی تنہائی کے اسی سمندر کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ میری روشنی کم ہو رہی ہے۔ میں محفل کا وہ چراغ ہوں جس کی لو مدھم ہوتی جا رہی ہے اور بالآخر کوئی ہاتھ مجھے اٹھا کر میری جگہ کوئی نیا چمکتا ہوا، تیز روشنی والا چراغ جلا کر رکھ دے گا اور ایسا ہی ہوتا رہے گا ہمیشہ، کیونکہ اس دنیا کی بقا اسی میں ہے۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو آفتاب، ایک دنیا تمہارے فن کا لوہا مانتی ہے۔ تمہارا نام ہی کسی پروگرام کو کسی فلم کو ہٹ کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ یہ مایوسی کی باتیں تمہیں زیب نہیں دیتیں۔ تم بلاشبہ اس وقت ملک کے کامیاب ترین فنکار ہو۔" مہتاب کی بات پر وہ ہنس دیا۔

"مہتاب میں نے عمر گزار دی لیکن میں کیسا بدنصیب ہوں جسے دنیا نے تو دیکھا لیکن اس کے باپ نے اسے آج تک نہیں دیکھا۔ آج تک اس کے کسی کام کی تعریف نہیں کی ہے نا کتنی بڑی کامیابی کی بات۔" اس کی ہنسی

میں محرومی کی گھلاوٹ ایسی ہی تھی جیسے تیز سفید روشنی میں کوئی سیاہ دھاری۔

"تم انتہا درجے کے احمق ہو۔ آفتاب! وہ وقت اور تھا، یہ وقت اور ہے۔ اُس وقت تم جوان تھے۔ آج تمہارے بچے جوان ہو چکے ہیں تم کسی بات پر اپنے باپ کو قائل نہیں کر سکے تھے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم اپنے بچوں کے ساتھ بھی وہی سلوک کرو۔ خود تم اپنے باپ جیسا طرزِ عمل اپنے بچوں سے روا نہیں رکھتے حالانکہ تم بھی اُن کی بہتری کے لیے ہی سوچتے ہو۔"

"میرے اور ابا کے طرزِ عمل کی یکسانیت میں تجربے کا بہت فرق ہے۔ میں نے ایک چیز کو پرکھ کر ایک بات کہی ہے اور ابا نے بغیر سوچے سمجھے، بغیر کچھ دیکھے مجھے روک دیا تھا اور شاید ابا کے اسی طرزِ عمل کے خلاف میرے دل و دماغ نے بغاوت کی تھی۔ اگر ابا ایک بار مجھے اپنی مرضی سے کام کرنے دیتے تو شاید دوسری بار میں خود اُن کی بات مان لیتا لیکن ابا نے تو مجھ پر اعتبار ہی نہیں کیا۔"

"تم کبھی نہیں سمجھ سکتے آفتاب۔ وہ تمہارے باپ تھے اور باپ صرف باپ ہوتا ہے۔" مہتاب زچ ہو کر رہ گیا تھا۔ آج پھر بحث اسی مقام پر آ گئی جہاں ہمیشہ آتی اور ختم ہو جاتی تھی۔

"اچھا چھوڑو، میں اور تم ہمیشہ سے اسی بات پر لڑتے رہے ہیں۔ اب بس کرو۔ ابھی تین سال کا طویل عرصہ پڑا ہے۔ اور ہاں۔" اُس نے مہتاب کو بازو سے پکڑ کر بلایا۔ "اگلے ہفتے W.H.O اور یونیسیف کے نمائندے یہاں آ رہے ہیں، پراجیکٹ کا معائنہ کرنے۔ میں نے سوچا ہے نفیس کو ابھی سے اس کام پر لگا دوں۔ ایف آر سی ایس کے بعد اسے زیادہ وقت نہیں ملے گا سروے کے لیے اور یاد رکھو اُس کے ایم بی بی ایس میں تین سال باقی ہیں۔ بس اب میں سوؤں گا۔" مہتاب نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اُس نے بات مکمل کر کے بیڈ پر لیٹ کر آنکھیں مُوند لیں۔

✻✻

"ڈیڈی!" وہ آرام کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے کسی خیال میں گم تھا کہ نفیس کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"آپ سے کچھ کہنا ہے۔" اُس کا لہجہ بڑا مضبوط تھا۔

"کہو۔" اُس کا سر ہنوز کرسی کی پشت سے ٹکا رہا اور نظریں بیٹے کے سراپے پر مرکوز ہو گئیں۔ اچانک اُسے احساس ہوا اُس کا بیٹا واقعی اُس کے ہی جیسے خون نقش سے کر پیدا ہوا تھا۔

"مجھے ایک ٹی وی چینل میں کام کرنے کی آفر ہوئی ہے اور میں نے ڈیسائیڈ کیا ہے کہ میں اس میں کام کروں گا۔" جھولتی ہوئی کرسی یکدم ساکت ہو گئی۔ بلکہ کافی دیر تک کمرے کی پوری فضا ساکت رہ گئی۔ صرف گھڑی کی ٹک ٹک سے حرکت کا احساس رہا۔ نفیس نے کہنے کو تو یہ بات کہہ دی لیکن اب اُس کی ہمت نہ تھی کہ وہ باپ کی طرف دیکھتا۔

عزیز آفتاب اچانک کرسی سے اُٹھا۔ ایک آواز مسلسل اُس کے دماغ میں گونج رہی تھی "باپ صرف باپ ہوتا ہے۔" اُس نے بیٹے کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ اُسے محسوس ہوا، اُس کا بیٹا اُس سے قد میں اونچا ہو گیا ہے۔ اُس کا وجود اُس کے چوڑے شانوں کے بیچ چھپ سا گیا۔

"او کے مائی سن، اینڈ بیسٹ وشز۔" نفیس کے فرشتے بھی اس جواب کی توقع نہیں کر رہے تھے۔ اسی لیے وہ ہکّا بکّا باپ کی شکل تکنے لگا۔ اُسے تو یقین تھا کہ عزیز آفتاب اُس کی مخالفت کرے گا لیکن یہاں تو معاملہ ہی اُلٹا نکلا۔ "لیکن میری ایک شرط ہے۔"

"جی، جی ڈیڈی۔" وہ بوکھلا گیا۔

"شوبزنس جوائن کرنے سے پہلے تمہیں میری مرضی سے شادی کرنا ہو گی اور میں تمہیں دلہن بھی وہ لا کر دوں گا جس کے ماں باپ کے خلوص کی بنیادوں پر تمہارا باپ آج پورے قد سے کھڑا ہے۔"

نفیس بے چارہ پہلے ہی حیرت زدہ تھا اس شرط نے اُسے مزید سٹپٹا دیا۔ "میں سمجھا نہیں ڈیڈی۔"

"شوبز کو گھر کے اندر نہیں لاؤ گے کیونکہ یہ تمہارے باپ کی صرف جاب تھی اور بس۔"

"اوہ اچھا۔" اُس پر بات کچھ کچھ واضح ہو رہی تھی۔ "ٹھیک ہے ڈیڈی میں سمجھتا ہوں۔" وہ ڈیڈی کو کیسے بتاتا اُس نے محض ضد میں آ کر یہ بات کی تھی ورنہ وہ تو پہلے ہی انکار کر چکا تھا۔

"اور ناز کے اِس فیلڈ میں جانے کے لیے ضد نہیں کرو گے۔" اب کی بار اُس پر پوری طرح باپ کی سوچ آشکار ہو گئی۔

"ڈیڈی۔ آپ کیوں فکر کرتے ہیں میں آپ کا بیٹا ہوں عزیز آفتاب کا بیٹا۔ مجھ پر اعتماد کریں میں ایسا کچھ نہیں کروں گا جس سے آپ کے نام پر حرف آتا ہو۔ مجھے آپ کی نیک نامی بہت عزیز ہے۔" اُس کا جی چاہا وہ بیٹے سے کہے "عزیز آفتاب کی نہیں، عزیز عبدالرحمٰن کی عزت کا پاس کرنا جس کی حفاظت وہ اپنی تمام زندگی کے ایک ایک لمحے میں کرتا آیا تھا۔"

"گاڈ بلیس یو مائی سن۔" بیٹے کو گلے لگا کر اُس کی پشت پر تھپکی دیتے ہوئے جانے کیوں اُس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا لیکن دنیا نے اُسے بلا وجہ ہی فنکار نہیں کہا تھا۔ نفیس باہر جا چکا تھا اور کرسی پر ایک فنکار نہیں، اب صرف ایک باپ بیٹھا رہ گیا تھا۔

✻✻

ناز اور نفیس کے لیے تو یہ باتیں حیران کُن تھیں ہی لیکن گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ناز کے ساتھ بیٹھی ہوئی رابعہ بھی کچھ کم حیران نہ تھی۔ وہ تینوں آنکھیں پھاڑے بالکل چُپ چاپ رضوان مہتاب کی زبان سے ساری داستان سن چکے تھے۔ مہتاب آج خاص طور پر رابعہ کو لینے کالج آیا اور واپسی میں نفیس کی گاڑی میں ہی اُن کے ساتھ بیٹھ گیا اور اس کے بعد ایک طویل داستانِ جدوجہد، محبت، محنت اور کرب سے بھرپور ان تینوں کے گوش گزار کر دی۔ ناز اور نفیس دونوں اپنی زندگی کے ایسے لمحات سے گزر رہے کہ شاید کبھی اپنے باپ کا روپ اُن کی نظر میں ہرگز نہ آ پاتا، جیسے آج وہ دونوں کھلی آنکھوں سے خیالوں کے دریچوں سے جھانک کر دیکھ رہے تھے۔ اُنھیں اپنے باپ پر فخر بھی ہوا اور اُس زندگی کے تند و تیز رُخ نے اُنھیں افسردہ بھی کر دیا۔

"ڈیڈی نے سارا دکھ اکیلے ہی اُٹھا لیا۔ کسی کو شریک نہیں کیا۔ مجھے بھی نہیں۔" نفیس کو اپنے بڑے ہونے کے باوجود باپ کی بات نہ سمجھ میں آنے ۔۔۔ کے احساس نے دکھی کر دیا۔

"تمہارا باپ ساری زندگی اپنے آپ سے لڑتا رہا اور تم لوگ سمجھتے رہے کہ وہ تم سے لڑتا ہے۔ زخم میں تکلیف ہو تو انسان چیخ اُٹھتا ہی ہے۔"

"میں تو ساری زندگی یہی سمجھتی رہی کہ ڈیڈی نے ہمیں خود سے الگ رکھا۔ وہ ہم سے محبت نہیں کرتے۔ ہم اسٹیشن پر ہر وقت ائیرپورٹ پر ریلیکشن پر اُن کا انتظار کرتے اور وہ نہیں آتے تھے۔ ریکارڈنگز، شوٹنگز اور بس کام ہی کام۔ مجھے تو اس لفظ سے نفرت ہی ہو گئی تھی۔ شوبز نے ہم سے ہمارے ڈیڈی کو چھین لیا تھا۔ میں تو بھیا سے کہتی تھی کہ کاش ہمارے ڈیڈی فنکار نہ ہوتے۔ کچھ بھی ہوتے بس یہ نہ ہوتے۔ ہمارے ساتھ ہماری خوشیوں میں شریک کرتے۔ مجھے کیا پتا تھا کہ وہ تو خود کو اسی اذیت کی سزا دے رہے ہیں جس اذیت سے اُن کے والدین گزر رہے ہیں۔" ناز کو اپنے باپ پر بہت ترس آیا۔

"ہاں بیٹے۔ آج میں نے ایک راز فاش کر دیا۔ مجھے ساری زندگی اب اس بات کا افسوس رہے گا کہ میں نے دوست کا اعتبار ختم کر دیا لیکن نفیس نے شوبز میں جانے کا کہہ کر شادی کے معاملے کو بہت آگے کر دیا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ فیصلہ زبردستی کسی پر ٹھونسا جائے۔" جب سے آفتاب نے اُسے فون کر کے نفیس اور رابعہ کی شادی کی بات کی تھی تب ہی اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ بچوں پر زبردستی کے فیصلے مسلط نہیں ہونے دے گا خواہ اس کے لیے اُسے دوستی کا، اعتماد کا، اعتبار کا خون ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

"آپ یقین کریں انکل۔" ناز نے اُس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھا۔ "ہم دونوں میں سے کوئی بھی کبھی یہ بات ڈیڈی پر بلکہ کسی پر بھی ظاہر نہیں کرے گا کہ آپ نے ہمیں سب کچھ بتا دیا ہے اور اس بات کے بعد کہ ڈیڈی نے بھیا کے لیے رابعہ کا انتخاب کیا ہے، اس سے تو ہمارے دل میں اُن کی عزت کچھ اور بڑھ گئی ہے۔"

"بیٹے! یہ فیصلہ آج کا نہیں، رابعہ جب پانچ سال کی ننھی جیجی آفتاب نے مجھ سے یہ بات کہہ دی تھی لیکن میں نے اُسے ہمیشہ یکطرفہ فیصلے سے روکا کہ جب بچے، بڑے ہو جائیں خود سمجھدار ہو جائیں تو اُن کی مرضی کے مطابق کام کیا جائے۔ اب اُس نے اچانک ہتھیلی پہ سرسوں جمانے کا فیصلہ کیا تو مجبوراً مجھے تم لوگوں کو اعتماد میں لینا پڑا کہ تم لوگ خود سمجھدار ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم دونوں بڈھے مل کر تم پر کوئی زیادتی کر جائیں۔" وہ تینوں اُن کے اس طرح خود کو بڈھا کہنے پر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

"نہیں انکل آپ تو بہت گریس فل ہیں۔" ناز کے برجستہ جملے پر مہتاب خوش دلی سے ہنس دیا۔

"چلو بیٹے۔ اب ہم تمہارے باپ سے کہیں گے کہ حساب برابر ہو گیا ہے تمہاری بیٹی ہماری بیٹی ہو گئی ہے۔"

نفیس نے دوبارہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بیک ویو مرر میں مسکراتی ہوئی رابعہ پر نظر ڈالی۔ اُس کے چہرے کے خوشگوار رنگ اور چمکتی ہوئی شوخ نگاہوں

نے رابعہ کو سمجھا دیا کہ آفتاب نے اپنے بیٹے سے زبردستی نہیں کی۔ شہزادہ سلیم اور انارکلی تو ایک دوسرے کو پسند کر چکے تھے۔ شکر تو یہ تھا کہ ڈیڈی نے اکبر بادشاہ کا کردار ادا نہیں کیا بلکہ انھوں نے تو خود ساری دیواریں توڑ کر انارکلی اُس کے حوالے کر دی تھی۔" تمہارا پراجیکٹ بڑے مکمل ہو گیا نفیس؟" مہتاب نے پوچھا۔

" انکل، اب مجھے آپ کی کسی بات پر حیرت نہیں ہو گی۔ آپ تو مجھے یہ بتایئے کہ کتنا کام ہو چکا ہے اس سلسلے میں۔ آپ یقیناً مجھ سے زیادہ جانتے ہوں گے۔"

" بھئی ہمارا تو کنسٹرکشن کا کام ہے۔ پہلے سینٹر کی تعمیر سے لے کر تمام پراجیکٹ کی ذمّے داری میری ہے۔ پھر بھی میں ہی پروائڈ کروں گا اور یہ سب کام یقیناً فری آف کاسٹ ہو گا۔ اصل میں آفتاب بہت سال سے اس سلسلے میں کام کر رہا ہے۔ تمھیں جو زمین دکار تھی وہ اُس نے اپنے ایک فین سے آدھی قیمت میں حاصل کی۔ یو۔ این۔ او میں کئی ایک پاکستانی اُس کے فین ہونے کی وجہ سے اُس کے دوست بنے اور اب اس پراجیکٹ میں اُس کے برابر کے مددگار ہیں۔ یوں سمجھ لو ایک مشترکہ مقصد کے حصول کے لیے چند مختلف شعبوں کے لوگ مل جل کر کام کر رہے ہیں۔ رہی W.H.O کی بات براہِ راست مدد کی تو وہ تم حاصل کرو گے۔ تم بحیثیت ڈاکٹر اُن کی ٹیم میں شامل ہو کر زیادہ بہتر کارکردگی دکھا سکو گے۔"

" یونیسیف کو اس پراجیکٹ سے کیا دلچسپی ہے؟"

" یونیسیف نے اس فلاحی منصوبے میں اس لیے دلچسپی لی تھی کہ سب سے زیادہ توجہ کے طالب بچے ہوتے ہیں۔ اگر بچے صحت مند ہوں اور باقاعدہ تعلیم حاصل کریں تو ہم آنے والی نسلوں کو ایک بہتر مستقبل فراہم کر سکیں گے۔ صحت اور تعلیم کا آپس میں گہرا ربط ہے اسی لیے جب ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن نے ایشیا میں اس منصوبے میں دلچسپی لی تو ان ڈائریکٹ طریقے پر یونیسیف بھی اِن ایشیائی لوگوں کے ساتھ مدد کرنے پر تیار ہو گئی لیکن اب چونکہ یہ ایک منظم منصوبہ بن گیا اس لیے پاکستان کی حد تک تمہارے باپ نے ایک مخلص گروپ پاکستانیوں کا بنا کر کام کے آغاز کا ارادہ کیا۔ اب یہ کام آنے والے تین سے پانچ سال میں مکمل ہو گا۔"

" زبردست۔" نفیس کی آنکھیں اُس کی گفتگو سُن کر چمکنے لگیں۔" اِس کا مطلب ہے ایک بڑا کام میرا منتظر ہے۔"

" صرف تمہارا نہیں۔" مہتاب نے تصحیح کی۔" ہم سب کا کہ ہم سب کچھ نہ کچھ تو کر سکتے ہیں۔ جو علم رکھتے ہیں۔ آفتاب بے شک تعلیم حاصل نہ کر سکا لیکن وہ علم سے بے بہرہ نہیں رہا۔ وہ تو نفیس آج سے دس بارہ سال پہلے شوبزنس چھوڑ چکا ہوتا لیکن پاکستان میں اس پراجیکٹ کی تکمیل کی غرض سے اُس نے خود کو اس فیلڈ میں زندہ رکھا تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں سے تعلقات پیدا کر سکے اور تم دیکھو وہ خاصی حد تک کامیاب رہا۔ وہ کہتا ہے کہ اگر بُرے کام کے لیے تعلقات استعمال کیے جاتے ہیں تو ایک اچھے کام میں تعلقات کیوں نہ استعمال کیے جائیں۔ اور تم کیا جانو محض آفتاب کی وجہ سے ہم بہت سے انجان لوگوں سے آسانی سے اپنا کام کروانے میں کامیاب رہے ہیں۔"

" ایک بات پوچھوں انکل؟" ناز نے پیچھے سے اُسے پکارا۔ " اِس کام میں پہلے آپ شریک ہوئے تھے ناں؟"

مہتاب نے مسکرا کے اُسے گھوم کر دیکھا لیکن اُس کی تردید یا تصدیق میں کچھ نہیں بولا کہ اِس کی ضرورت نہیں تھی۔

**

۱۸ اگست کی رات بھیگ چکی تھی۔ باہر تیز بارش تھی اور عزیز آفتاب کے گھر مبارکباد کے فون کالز ابھی تک موصول ہو رہی تھیں۔ ۱۴ اگست کو اُسے پرائڈ آف پرفارمنس کا اعزاز دیا گیا تھا۔ وہ آج پہلی بار اس تقریب کی ویڈیو دیکھ رہا تھا جس میں اُسے پرائڈ آف پرفارمنس دیا گیا تھا کہ اتنے میں ملازم نے کسی کی آمد کی اطلاع دی — وہ گاؤن پہن کر ڈرائنگ روم میں آیا تو ناز اور نفیس کے ساتھ مہتاب کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔" تم! خیریت تو ہے؟ تم یہاں کیسے؟"

" ہاں آؤ تم چلو میرے ساتھ۔"

" لیکن آخر میں کہاں چلوں۔ مہتاب بتاؤ تو میرا دل بیٹھ جا رہا ہے۔ ابا تو ٹھیک ہیں نا؟" ناز اور نفیس کے ساتھ اُن کی ماں کے لیے بھی یہ منظر کسی ڈراٹے کہ نہ ہوتا اگر وہ اس راز سے واقف نہ ہوتیں۔ ناز نے اپنی والدہ سے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی تھی۔

" ابا، اماں دونوں ٹھیک ہیں۔ تم چلو۔ اور بھئی بھلا میں کون ہوتا ہوں یہ میں اگر بتاؤں گا پہلے ذرا تمہارے باپ کا ایک مسئلہ حل کر دوں۔" مہتاب گاڑی میں جا کر بیٹھا تو آفتاب شرٹ کے بٹن بند کرتا ہوا اُس کے ساتھ آ بیٹھا۔

" بات کیا ہے آخر؟" وہ بہت بے قرار تھا۔ مہتاب نے

گاڑی اسٹارٹ کر کے سڑک پر ڈال دی۔

" جانتے ہو آفتاب۔ ہر انسان کی زندگی میں ہر دس پندرہ سال کے بعد ایک بہت بڑا چیلنج آتا ہے اور وہ سب کچھ تبدیل ہو جاتا ہے جو اُس کے ذہن اُس کی سوچ یا اُس کی زندگی میں بہت عرصے تک رہتا ہے۔"

باہر بارش شروع ہو چکی تھی۔ مہتاب نے وائپر چلا دیے اور پانی کے جن قطروں سے باہر کا منظر دھندلا ہو گیا تھا وہ ایک دم صاف ہو گیا۔ ہر چیز صاف نظر آنے لگی۔

" ایسا ایک چیلنج تمہاری زندگی میں بھی اُس دن آیا تھا جب تم مجھ سے ملے تھے یاد ہے۔ اور ایک چیلنج آج کے دن آئے گا لیکن صرف تمہارے اندر نہیں ایسا ہر ایک کے ساتھ زندگی کے کسی نہ کسی حصّے میں ہوتا رہتا ہے۔"

" میری کچھ میں تمہاری کوئی بات نہیں آ رہی، اور یہ تم جا کہاں رہے ہو؟" جانے پہچانے راستے کو دیکھ کر وہ چونک اُٹھا۔

" وہیں اُسی گھر جہاں کبھی تم مجھے لے کر گئے تھے۔"

" مہتاب!"

" پہلے خاموشی سے میری بات سنو پھر کچھ کہنا۔" اُس نے گاڑی کی رفتار دھیمی کر دی۔" سنو تم چاہتے تھے ناں کہ تمہارا باپ تم پر اعتبار کرے۔ تم اُن سے تسلیم کرواؤ کہ تم نے اُن کی عزت کو برباد نہیں کیا۔ تو آفتاب سنو چار دن پہلے بھیجا اماں کے پاس وہیں رُک گئی تھی۔ اُس نے رابعہ اور ریحان کو واپس بھیج دیا تھا۔ دوسرے دن میں صبیحہ کو لینے گیا تو جانتے ہو اُس نے مجھے کیا بتایا؟"

" کیا؟" اُس کا رُواں رُواں ہمہ تن گوش ہو گیا۔

" اُس نے بتایا کہ رات کو تیز بارش ہو گئی تو وہ اِس خیال سے کہ پتا نہیں ابا اماں نے کھڑکی دروازے بند کیے یا نہیں وہ اوپر کی منزل پہ گئی تو اُس نے دیکھا اماں اور ابا ریحان والے کمرے میں بیٹھے ہیں۔ اُسے حیرت ہوئی۔ اُس نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا تو جانتے ہو وہ دونوں اِس پروگرام کو دیکھ رہے تھے جس میں تمہیں پرائڈ آف پرفارمنس دیا گیا تھا۔"

" تم جھوٹ بول رہے ہو۔ کیا کہا تم نے؟" اُس نے بے یقینی سے مہتاب کے اسٹیئرنگ پر رکھے ہاتھ تھام لیے۔

" ہاں ہاں یہ سچ ہے۔ ابا تمہیں دیکھ رہے تھے۔ اور جانتے ہو صدرِ پاکستان سے تمہیں یہ اعزاز لیتے دیکھ کر اُن کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔ اُنھوں نے اماں سے کہا تھا۔ سکینہ کی ماں آج تمہارے بیٹے نے وہ منزل پا لی جس کی تلاش میں وہ گھر سے نکلا تھا۔ وہ جس آسمان کا چاند بننے جا رہا تھا، شکر ہے اُس کے راستے کی دُھول نہیں بنا۔ دیکھو آج وہ تمام ستاروں میں سب سے زیادہ روشن ستارہ بنا ہوا ہے۔"

" مہتاب گاڑی روکو۔" باہر اس وقت بھی تیز بارش ہو رہی تھی۔

" کیا ہوا؟"

" مہتاب پھر سے کہو۔ ایک بار پھر کہو۔ وہ سب کچھ جو تم نے ابھی کہا، بار بار کہو۔ کیا واقعی ابا نے مجھے ٹی وی پہ دیکھا تھا۔ حافظ عبدالرحمٰن نے مجھے ٹی وی پر دیکھا تھا؟" اُس نے بے

یقینی سے مہتاب کے چہرے کو دیکھا۔

"ہاں واقعی۔ وہ تمہارے باپ ہیں آفتاب۔ اُنھوں نے تمہیں ایپری شیٹ کیا ہے۔" اُس نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ تیز بارش کی پھوار نے اُسے بھگو دیا۔

"کیا کر رہے ہو؟" مہتاب کی آواز سے بے نیاز وہ گاڑی سے اُتر کر دائیں بائیں ہاتھ پھیلائے تیز بارش میں بھیگتا رہا۔

"ابا نے مجھے دیکھا۔" یہ خوشی بارش کے قطروں کی طرح اُس کی بے آب زندگی کو تر کرتی جا رہی تھی — مہتاب کو یقین تھا اُس کے چہرے پر بہتی پانی کی دھاریں صرف بارش کی نہیں۔ ایک برسات اُس کی آنکھوں سے بھی جاری تھی۔ "ابا نے مجھے دیکھا۔" وہ دونوں بازو پھیلائے گول گول گھوم گیا۔ مہتاب کے ہونٹوں پر پُرخلوص مسکراہٹ رینگ گئی۔ وہ شاید بہت دیر تک بھیگتا رہتا کہ اچانک کسی طرف سے ٹریفک کانسٹیبل کی سیٹی نے اُسے چونکا دیا۔ تیز روشنی اُس کے چہرے کا طواف کر رہی تھی۔

"اے رُکو۔ کون ہو تم؟" وہ لپک کر گاڑی میں بیٹھ اور مہتاب نے گاڑی منزل کی طرف دوڑا دی لیکن جاتے جاتے اُسے کانسٹیبل کی حیرت بھری آواز ضرور سنائی دی تھی۔ اُس نے کہا تھا۔ "اوئے یہ تو بالکل عزیز آفتاب کی طرح لگتا ہے۔"

٭٭

سیڑھیوں کی ریلنگ پر بیٹھے ریحان کے لیے یہ منظر یقیناً حیرت انگیز تھا۔ اُس کی پردہ دار نانی ایک شخص کو گلے لگائے ہوئے تھیں اور آنے والا شخص نانی کی آغوش میں چھپ کر حسرت آنسو بہا رہا تھا۔ وہ ریلنگ سے اُتر کر ٹیلیفون اسٹینڈ کے پاس کھڑے رضوان مہتاب کے پاس آ گیا۔

"بابا! یہ تو..."

"صحیح پہچانا تم نے۔ عزیز آفتاب ہی ہیں۔" مہتاب نے اُس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے بات مکمل کر دی۔ "لیکن اس وقت تمہارے سامنے عزیز آفتاب نہیں صرف عزیز عبدالرحمٰن ہے۔ حافظ عبدالرحمٰن کا بیٹا، تمہارے باپ کا بہت بڑا محسن۔"

ریحان نے سر گھما کر ایک ماں کو دیکھا جو بیٹے کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں تھامے برسوں کی دیدار کی پیاس بجھا رہی تھی۔

"محسن؟" وہ باپ کی بات پر اُلجھ گیا۔

"ہاں۔ تمہارے باپ پر اُنھوں نے زندگی میں ایک ایسا احسان کیا تھا جس کا بدلہ تمہارا باپ کبھی نہ دے سکے گا۔ جاؤ نانا کو اُٹھا کر بٹھا دو۔"

ریحان دو دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر چلا گیا۔ صبیحہ اور مہتاب نے اپنا یہ بیٹا حافظ عبدالرحمٰن کی دیکھ بھال کے لیے بھیجا ہوا تھا۔ مہتاب آہستہ آہستہ چلتا ہوا اُن دونوں کے قریب آ گیا۔

"مہتاب بیٹے! دیکھو میرا بچہ کتنا بدل گیا ہے، کتنا کمزور ہو گیا ہے۔ یہ تو بڑا خوبصورت تھا۔" ماں کی نظریں اولاد کے اندر تک کی کمزوری کو پہچان لیتی ہیں۔ اُس کے اندر کا دُکھ بھی ماں نے دیکھ لیا تھا۔

"ہاں ماں جی! جب بیٹے ماں باپ کی گھنی چھاؤں سے دُور ہو کر زندگی کا سفر تیز دھوپ میں خود ہی طے کرنا چاہتے ہیں تو اُن کا رنگ رُوپ برباد ہی ہو جاتا ہے۔"

"سچ کہتے ہو مہتاب۔ تھوڑا بہت نہیں پچیس برس میں نے جھلستے ہوئے گزار دیے اور یہ میرا ہی فیصلہ تھا۔" اُس نے ماں کے بوڑھے شکن آلود ہاتھوں کو تھام لیا۔ "لیکن ماں کی گود میں ہر آگ ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔"

"چلیے پاپا! نانا کو بٹھا دیا ہے میں نے۔" ریحان کی آواز پر وہ لوگ اوپر چل پڑے۔

"اماں، ابا مجھ سے مل لیں گے۔" دروازے پر پہنچ کر وہ رُک گیا۔

"بیٹے! وہ ماں باپ ہی کیا جو اولاد کی غلطیوں کو نظرانداز کر کے اُسے گلے نہ لگائیں۔ یہی تو فرق ہے ورنہ ماں باپ تو جانور بھی ہوتے ہیں۔" اُسے پشیمانی کے ایک شدید احساس نے آ گھیرا۔ وہ ایک ایسے شخص کا سامنا کرنے جا رہا تھا جو شاید اُسے اِس دنیا میں سب سے زیادہ جانتا تھا اور چاہتا تھا۔

"ابا!" مدھم سی آواز گونجی۔ جیسے کوئی بہت چھوٹا سا معصوم سا بچہ اندھیری گلی میں باپ کی انگلی چھوڑ کر آگے آگے بھاگ جائے اور پھر اندھیرے سے ڈر کر وہیں کھڑے کھڑے باپ کو پکارے، اِس یقین کے ساتھ کہ اُس کا باپ جلدی سے آ کر اُسے گود میں بھر لے گا اور وہ محفوظ ہو جائے گا۔

ابا کو وہیل چیئر پر بیٹھا دیکھ کر اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ ابا نے اُس کی آواز سُن لی تھی لیکن یہ کوئی فلم کا منظر نہ تھا کہ معجزہ رُونما ہو جاتا اور فالج زدہ بوڑھا باپ بیٹے کی آواز سُن کر وہیل چیئر سے کھڑا ہو جاتا اور بیٹے کو گلے لگا لیتا۔ اُس نے بارہا یہ منظر ریکارڈ کرایا تھا لیکن یہ اصل زندگی تھی۔ ریحان نے وہیل چیئر کا رُخ بدلا تو باپ کی نظر بیٹے سے ملی۔ نہ کوئی میوزک بجا نہ کہیں سے ایکشن کی آواز آئی

ورنہ ہی کسی نے نگاہوں کا کلوز اپ لیا۔ وہ باپ کے قدموں میں جا کر بیٹھ گیا اور اُن کی مفلوج ٹانگوں پر سر رکھ کر وہ سارے آنسو ندامت بہا ڈالے جو عرصے سے اُس کے دل میں طوفان قیامت برپا کیے ہوئے تھے۔ اُسے یاد تھا ابا جب کسی شاگرد سے ناراض ہوتے تھے تو جب تک ہاتھ اُٹھا کر اُس کے سر پر ہاتھ نہ پھیر لیتے شاگرد کو اُن کی ناراضگی اور غصے کا یقین رہتا تھا۔ وہ اسی انتظار میں تھا حالانکہ اُسے یاد تھا کہ ابا فالج کے بعد اپنے ہاتھوں کو کسی سہارے کے بغیر حرکت نہیں دے سکتے۔ حافظ عبدالرحمٰن رُک رُک کر اور ٹوٹے الفاظ کو موڑ کر بول سکتے تھے۔

"بہت... دیر... کر دی تم نے... باپ... تو بہت بوڑھا ہو گیا... بیٹ...ا۔"

"ابا! آپ نے مجھے معاف نہیں کیا؟"

"تم... نے اپنی منزل تو پا لی... بہت دُور... جا کر... دیکھو..." وہ رُک گئے۔ اماں کو بہر حال کسی بات کہنے کے لیے لفظوں کی ضرورت نہ تھی۔ اُنھوں نے ابا کی [illegible] کی جیب سے ایک بند لفافہ نکالا۔ اُس نے لفافہ کھول کر دیکھا تو [illegible] کے بنے ہوئے آنسوؤں کی شدت میں بے ساختہ روانی آ گئی۔ وہ ابا کے لرزتے ہوئے ہاتھ پر سر رکھ کر سسک پڑا۔ یہ وہی چار سو روپے تھے جو اُس نے مہتاب سے بھجوائے

"ان... کے بدلے... تم... خود آ جاتے... تو تمہارا [illegible] دوبارہ... زندہ ہو جاتا۔"

"ابا! آپ کو پتا تھا۔" وہ یہ تو بھول ہی گیا تھا کہ ماں [illegible] اولاد کو اُس کی خوشبو سے پہچان لیتے ہیں۔ تو اُس کے بھیجے ہوئے پیسوں سے اُس کی خوشبو کیوں نہ کشید کر لیتے۔

"یہ ہم نے اس لیے رکھے تھے کہ یہ تمہارے ہاتھوں کو چھو کر تو آئے تھے۔ اس کے بعد ہر شے ہم اسی لیے رکھتے چلے [illegible] کہ ان چیزوں نے تمہارے ہاتھوں کو چھوا ہو گا۔ ان میں تمہاری خوشبو رچی بسی ہوتی تھی۔" اماں کی آواز پر اُس نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ ابا کی آنکھ سے ایک آنسو رخسار پر آ گیا۔ اُس نے آنسو کو اپنی ہتھیلی پر سمیٹ لیا۔ اُسے لگا ابا وضع داری، اصول پسندی اور سچائی کی ایسی بوسیدہ عمارت کی طرح ہیں جو جگہ جگہ سے خستہ حال ہو چکی ہے لیکن اُس کی بنیادیں ابھی تک اتنی ہی مضبوط ہیں کہ اُن پر ایسی ہی کوئی دوسری شاندار عمارت تعمیر کی جا سکتی ہے۔

"ابا! ابھی میری منزل نہیں آئی۔ ابھی تو سفر کا آغاز ہے۔ ابا! میرا بیٹا ڈاکٹر بن رہا ہے۔ وہ ڈاکٹر بن کر صحت کی عالمی تنظیم کے ساتھ شامل ہو کر پورے ملک میں لاچار مریضوں کے علاج اور دیکھ بھال کے مراکز میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ کام کرے گا۔ ہم بوڑھوں اور بچوں کو تحفظ دیں گے۔ جن کو کوئی مدد نہیں دیتا، ہم اُن کی مدد کریں گے۔ ابا! میرے سب بچے قرأت کرتے ہیں۔ میرا چھوٹا بیٹا حافظ ہے۔ اور ابا! جب وہ قرأت کرتا ہے تو شاید تھوڑی دیر ہوا بھی ٹھہر کر اُسے سنتی ہے۔ ابا! میری بیٹی اُستاد بننا چاہتی ہے۔ ابا! جو خواب آپ نے میرے لیے دیکھے، وہ میرے بچے پورا کر رہے ہیں۔ آپ یہی سب کچھ مجھ سے چاہتے تھے نا؟" اُس نے ابا کو اُمید کی نظر سے دیکھا۔ "ابا! میں تین سال بعد ملک سے باہر جا رہا ہوں۔ وہ سب کرنے جو میرا بیٹا اور نہ جانے کتنے بیٹے مل کر کریں گے۔ ابا! آپ مجھے دعا دیں گے نا؟" اُس کی بند آنکھوں سے اُمید کے دیے برسنے لگے۔ نہ جانے کیسے ابا کا لرزتا ہوا ہاتھ اُٹھا۔ اور اُس کے جھکے ہوئے سر پر آ کر رُک گیا۔

"سکینہ... کی ماں... تمہارا بیٹا کامیاب ہو گیا... شکر ہے... خدا کا۔"

اُسے لگا وہ جس پرائڈ آف پرفارمنس کی تلاش میں یہاں وہاں دن رات بھٹکتا پھرتا رہا، وہ پرائڈ آف پرفارمنس تو جیسے آج اُسے ملا تھا۔

٭٭

چار سال بعد کراچی انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر آج بھی گہما گہمی ویسی جیسی ہمیشہ ہوتی تھی۔ لیکن آج ٹرمینل سے ایک فنکار ایسے کردار کی ادائیگی کے لیے روانہ ہو رہا تھا جو قدرت کسی کسی کے لیے منتخب کرتی ہے۔ وہ ایسی پرفارمنس دینے جا رہا تھا جو کسی بھی فنکار کی زندگی کا سب سے عظیم لمحہ ہوتی ہے۔ اور یہ وہ پرفارمنس تھی جس کا اعزاز کوئی حکومت نہیں دیتی، اُس کا اعزاز وہ تشکر کے آنسو، پیار کے وہ لمحے ہوتے ہیں جو کسی کے دل سے تکلیف میں دی جانے والی دعا کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔

ایئرپورٹ پر کھڑے اُس کے دوست نے اور اُس کے بچوں نے اُسے رخصت کیا۔ اُس کے دوست نے کہا تھا۔

"یہ وہ پرفارمنس ہے جو لازوال ہے۔ آج کے بعد تمہیں کبھی زوال نہیں آئے گا۔"

اور اُس کے دل نے گواہی دی کہ ہر فنکار کو زوال ہے لیکن محبت ایسا فن ہے جس کو کبھی زوال نہیں۔ اور انسانوں سے محبت کرنے والا کبھی ناکام نہیں ہوتا۔ وہ بھی کامیاب رہا تھا۔ ○